بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ — ۱۰؍اگست ۲۰۲۶ء مطابق ۲۶؍صفر المظفر ۱۴۴۸ھ — شمارہ نمبر ۱۹

اس شمارے میں

شعر و ادب	ظفر علی خاںؒ، حفیظ جالندھریؒ	۴
آمدِ موسمِ بہار	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۵
کفر کی ہٹ دھرمی	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
رسول اللہؐ کے اخلاقِ کریمانہ	مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی	۹
سوال و جواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۰
جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار	ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی	۱۱
عہدِ نبویؐ کی جنگیں اور ان کے اثرات	مولانا محمد شعیب ندوی	۱۳
مغرب اور اسرائیل کا میکیاویلی نظریہ	مولانا محمد فرمان ندوی	۱۵
میڈیا کے میدان میں پانچ لازمی اقدامات	مولانا منور سلطان ندوی	۱۸
استغفار کے ثمرات اور مسنون اذکار	مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی	۲۱
قرآنی تمثیلات میں پنہاں اشارات	مولانا محمد اعظم ندوی	۲۴
کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالمؐ بن کر	محمد جاوید اختر ندوی	۲۷
تعارف و تبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۹
سیرت النبیؐ کا عربی ترجمہ	محمد نفیس خان ندوی	۳۱

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کراکے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھی تو ہو!

نتیجۂ فکر: مولانا ظفر علی خانؒ

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو

مجھ پُرخطا کی لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے
مجھ ننگِ دو جہاں کا وسیلہ تمھی تو ہو

جو دست گیر ہے وہ تمہارا ہی ہاتھ ہے
جو ڈوبنے نہ دے وہ سہارا تمھی تو ہو

دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھی تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تار الست سے
اس نورِ اولیں کا اُجالا تمھی تو ہو

جلتے ہیں جبرئیل کے پَر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھی تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایت اولیٰ تمھی تو ہو

سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوعِ انسانی!

نتیجۂ فکر: جناب حفیظ جالندھریؒ

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوعِ انسانی

ترے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہوگیا پھر فضلِ ربانی

سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم، انساں کو سکھلا ئے
یہی اعمالِ پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہوچکی اجزائے ہستی کی پریشانی

زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہوجائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی

حفیظؔ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ اُلفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

ترا دَر ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

اداریہ

آمدِ موسم بہار

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

گلشن انسانیت کو اپنی جس مکمل ترین بہار کا انتظار رہا اور جس کے لیے کائنات میں ''ارض'' نام کے خطہ سے خالق کائنات کی مشیت راضی ہوئی، اس کرۂ ارض یعنی دنیا نے اپنی آغوش کو انسانوں کے لیے وا کیا۔ انسانیت کے مفہوم ومعانی ومقاصد کو وجود میں لانے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو کائنات میں پہلے انسان اور پھر بے حدو بے شمار انسانوں کی تخلیق کا اولین ذریعہ بنایا گیا۔ اسی دن سے گلشن انسانیت میں نئے نئے موسم آتے رہے، بہاریں بھی آتی رہیں، گزرتی رہیں۔ بہار آتیں تو خوشبوؤں سے انسان کا وجود مشکبار ہو جاتا اور جب دورِ خزاں آتا تو سوکھی اور مرجھائی انسانیت پھر سے بہاروں کی امید میں فریاد بہ لب ہو جاتی۔ بہار وخزاں کے یہ موسم صدیوں بلکہ ہزاروں سال کی آباد دنیا سے گزرتے رہے۔ آخر کار جب دنیا کے کامل ہونے، اس کے نقشوں کے پورا ہونے اور انسانی عقل وشعور کی پختگی کے نتیجے میں خالق کائنات کی مرضی ومنشا کے بلند ترین پیانے پر انسانی سطح کے ظہور کا وقت آیا تو پھر انسانیت کے گلشن کی اس بہار کی آمد ہوئی جس نے گزشتہ بہاروں کی ہر کمی کو اس طرح پورا کر دیا کہ پھر اس دنیا کو نئی زندگی میں کسی اور بہار کی ضرورت نہیں رہی۔

ربیع الاول یعنی اول بہار کا مہینہ ایسی اولیت کا پیغام لایا کہ قیامت تک کے موسموں کے لیے یہی اول ہمیشہ آخر کا پیغام دیتا رہا۔

رسول اکرمؐ کا ظہور اصلاً اسی بہار انسانیت کے لازوال عروج کا اعلان بن گیا۔ جس ذہن اور احساس نے رسول اکرمؐ کا نام نامی محمدؐ رکھا وہ یقیناً قدوسی وملکوتی صفت سے مستعار رہا ہوگا۔ ورنہ یہ معنی کہاں سے انسانی ذہن میں اترتے کہ محمد کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو، یعنی قدرت کی جانب سے بنی نوع انسانی کو کمال کی جن آخری حدود یا آخری سرحد تک پہنچانا انسان کی تخلیق کا مقصد تھا، وہ رسول اکرمؐ کے وجود کے ذریعہ پورا کر دیا گیا۔ ایک صاحب نظر نے کیا خوب بات لکھی کہ لفظ محمد کے معنی میں مخلوق کامل کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔ اس کی تشریح بھی کی گئی کہ علم اور عمل یہی دو وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے انسان کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اور یہی تخلیق کائنات کا لب لباب ہے اور اس کے اظہار کے لیے محمد کے لفظ سے زیادہ جامع کوئی لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنی ایسا لفظ جس کے معنوں میں علم وعمل کی بنیاد پر وہ تعریف شامل ہو، جس کا سلسلہ لامتناہی ہو، تعریف کے الفاظ دنیا جہاں سے آتے رہیں اور محمد کی معنویت پھر بھی ختم نہ ہو۔ لوگ نبی اور رسول ہونے کے لیے معجزوں کی طلب سے اپنے ذہن ودماغ کی عاجزی کا اعلان کرتے ہیں، اگر صرف اسم محمدؐ پر غور کر لیا جائے تو پھر کسی دلیل اور ثبوت کی بھی ضرورت نہ رہے۔ ایک ایسا نام جو اپنی شخصیت کی پوری زندگی کا آئینہ بن جائے، بجائے خود معجزہ کی شان رکھتا ہے۔

رسول اکرمؐ کی زندگی کے مطالعہ میں حرف حرف اور سطر سطر میں صرف اسی خوشبو لازوال کا اثر ہے جس سے انسانیت کے گلشن کی بہار کو اول وآخر کی بے نظیر اور بے مثال صفت عطا کی گئی۔ اس موسم بہار کی ایک ایک گھڑی، ایک ایک لمحہ کا انتظار، کرۂ ارض پر موجود ہر انسان کا فطری اور عقلی اور قلبی تقاضا تھا اور ہے۔ دنوں کے حساب سے اب اس کی سالانہ گردش پوری ہونے میں چند دن رہ گئے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے سیرت نگار کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ محض عقیدت کی انتہائی بلندیوں ہی کا اعلان نہیں تھے بلکہ یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت کے ترجمان بھی تھے کہ ''چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کی انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے۔

رسول اکرمؐ کا نام اور اس دنیا میں آپ کا ظہور سب کچھ اسی معجزانہ شان سے ہے کہ اگر قلب ونظر پر پردے نہ پڑے ہوں تو پہلی نگاہ ہی زبان بن جاتی ہے کہ آپ تو کچھ اور ہی ہیں۔ لیکن تو چیزے دیگری۔ کسی بچپن نے جوانی تک کا سفر اس طرح طے نہیں کیا کہ وجود کے دامن پر کوئی ہلکا سا بھی داغ ہو۔ بلکہ

پہچان، سچے صادق اور امین کی ہو، سن رشد نے خود کو رشد کے معانی سے اس طرح آشنا نہ پایا ہوگا۔ ایسے میں کارِ نبوت کے اعلان کے بعد اچانک سچائی اور امانت داری کو ظلم وستم کے ذریعہ ایک پورے وجود ہستی کو داغ داغ کر دینے کا شیطانی عمل بھی انسانیت کی نظروں میں کبھی نہ آیا ہوگا۔ نبوت کے ابتدائی سات برس کی جسمانی و ذہنی اذیتوں کا شمار اور حساب کس کے بس کی بات ہے۔ رشتہ داروں، دوستوں، کمزور طبقے کے ساتھیوں، عورتوں، بچوں سب پر ظلم وستم کی انتہا اور اس کے لیے جو کل تک صادق و امین اور معتبر و محبوب تھا، سات برس بعد اذیتوں اور تعذیبوں کا یہ عالم کہ قتل کی دھمکیاں ایک طرف، دوسری طرف تعلق والوں، خاندان اور رشتوں کی نسبت رکھنے والوں، عورتوں اور بچوں کو ایک گھاٹی میں قید کر کے ان کا مکمل سماجی بائیکاٹ ۔یعنی حیوانیت کی ہر حد کو پار کیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک امین وصادق ومعتبر کو گھر بار سب چھوڑنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ دنیا میں ہر لمحہ ہر پل کسی کی زندگی میں اتنے نشیب و فراز آئے؟۔ یہی نہیں جب اسی وجود نے ایک طاقت، حکومت، قبولیت اور کامرانی وہ کامیابی کا سماں پیش کیا تو رحمت، شفقت، معافی اور ہر تلخی کو بھلا دینے کی وہ خوبیاں بھی سامنے آگئیں جن کا نظارہ کیا، جن کا تصور بھی ایک انسانی معاشرہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ انسانیت کے کامل موسم بہار کی حیات آفرینیوں کو جاننے اور سمجھنے سے زیادہ موجودہ موسموں کو اور کس سیرت کی بادِ نسیم اور مشکبار صبا کی ضرورت ہے؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔

☆☆☆

آزادی کا حقیقی مفہوم

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

"ملک کی آزادی کی اس نعمت اور کارنامہ کا حق یہ تھا کہ ہم ہر قیمت پر اور ہر طرح کی قربانی دے کر اس کی حفاظت کریں، اور اس کی آبرو اور عزت قائم رکھیں، اس پر ہر دور میں اور ہر جگہ فخر اور شکر کے جذبات کا اظہار کیا جائے، غلامی کے دور کے تصور سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور ہمارے اندر کراہت وحقارت، نفرت اور "گھن" کا ایک جذبہ پیدا ہو اور ہم کسی حال میں اس دور کے واپس آنے کا تصور اور اس کو ترجیح دینے کا تخیل بھی گوارہ نہ کرسکیں۔

-----پھر کسی آزاد ملک میں جس نے ملک کی آبادی کے تمام عناصر اور قوموں اور فرقوں کے تعاون، جدوجہد اور قربانیوں کے ذریعہ آزادی حاصل کی ہو، اس کی قیادت اور رہنمائی میں وہ ملک آزاد ہوا ہو، اس کا کوئی جواز نہیں کہ کوئی ایک فرقہ یا قوم، خواہ وہ کیسی کھلی اکثریت اور بڑی تعداد میں ہو، اور کیسا ہی سرمایہ دار اور باوسائل ہو، وہ نہ صرف اپنی تہذیب وثقافت، اپنے عقائد اور دیو مالا کی تعلیم وتبلیغ اور اس کو اپنی نئی نسل کی طرف منتقل کرنے اور اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی زبان ورسم الخط کے نہ صرف رواج دینے اور قائم رکھنے میں، بلکہ پورے ملک پر اور نئی نسل پر اس کو جاری اور رائج کرنے میں آزاد ہو، اور دوسرا فرقہ، دوسرا مذہب رکھنے والے (خواہ وہ اپنی تعداد میں کئی ملکوں کے اسی مذہب کے باشندوں سے زیادہ تعداد رکھتے ہوں) اپنے دین ومذہب کے مطابق تعلیم دینے، اپنی زبان ورسم الخط کی ترویج وبقا، اپنی تہذیب وثقافت کے تسلسل کی کوشش میں آزاد نہ ہو، روز بروز اس پر نئی نئی پابندیاں عائد کی جائیں اور رفتہ رفتہ وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ چلنے پھرنے، کھانے کمانے میں تو آزاد ہے لیکن لسانی، ثقافتی اور تعلیمی طور پر پابند اور غلام ہے۔

حقیقت میں وہ آزادی آزادی ہی نہیں جس کا سایہ ملک کے ایک حصہ پر پڑے، دوسرا حصہ محروم رہے، ایک فرقے کے حق میں آزادی کی بہار آئے اور اس کا باغ نئے برگ وبار لائے اور دوسری جگہ خزاں کا دور دورہ ہو اور نئے نئے علمی اور ذہنی، تعلیمی و تربیتی اور مذہبی واعتقادی طوق وسلاسل اور رکاوٹوں اور پابندیوں کا منظر!"۔

☆☆☆

تعلیم القرآن

کفر کی ہٹ دھرمی

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ} (البقرۃ: ٦)

(یقینا وہ لوگ جنھوں نے انکار ہی طے کرلیا ہے، ان کے لیے برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ نہ مانیں گے۔)

اس آیت میں اہل شرک وکفر میں سے خاص طور پر ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اپنے لیے کفر طے کرلیا ہے، اب وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہٹ دھرمی میں لگے ہوئے ہیں۔ بعض حضرات یہ بات کہتے ہیں کہ اس سے مراد مدینہ منورہ کے وہ یہود ہیں جنھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ہم کو ماننا نہیں ہے، یہاں تک کہ بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ انھوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن جب آپ ﷺ نے ان سے یہ فرمایا کہ مانتے کیوں نہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو نہ ماننا طے کرلیا ہے۔ دراصل ان کے دل میں یہ بات تھی کہ آخری نبی بنو اسماعیل میں کیوں آگیا؟ یہ تو ہمارا حق تھا اور ہماری جاگیر تھی۔ گویا انھوں نے اپنے لیے یہ ایک پیمانہ بنا لیا تھا، خود قرآن مجید میں ہے: {يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَ هُمْ} (البقرۃ: ١٤٦) (وہ آپ کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)۔

یہود کے متعلق کہا گیا کہ جس طرح انھیں اپنے بیٹوں کے متعلق یقین ہے کہ وہ ان کی اولاد ہیں، اسی طرح انھیں حضور ﷺ کے متعلق علم ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اس لیے کہ وہ نشانیوں کو دیکھتے ہیں، کتابوں کو سمجھتے ہیں اور ان کو پورا یقین ہے لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ جاننا اور بات ہے، ماننا اور بات ہے، ہمیں ماننے کا مکلف کیا گیا ہے، جاننا اچھی چیز ہے لیکن اگر آدمی جانے اور نہ مانے تو کچھ بھی حاصل نہیں، اصل چیز اطاعت ہے، اگر آدمی مانے گا تو مومن شمار کیا جائے گا اور اگر نہیں مانے گا تو ایمان والا شمار نہیں کیا جائے گا۔

یہودیوں کا حال یہ تھا کہ بعض مرتبہ وہ یقین کی حد تک جانتے تھے لیکن ان کے اندر ہٹ دھرمی تھی اور انھوں نے طے کرلیا تھا کہ ہمیں ماننا نہیں ہے، یہاں پر ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ ہے، نہ کہ عام اہل کفر وشرک کا، عام مشرکین کا حال تو یہ ہے کہ اگر ان میں دعوت کا کام ہوگا تو انشاء اللہ وہ ایمان لائیں گے جیسا کہ حضور اقدس ﷺ کے مکی و مدنی دور میں ایک بڑی تعداد میں لوگ اسلام کے اندر داخل ہوئے لیکن جو لوگ ہٹ دھرم تھے وہ مکہ میں بھی تھے جیسے: ابولہب، ابوجہل وغیرہ، ان میں سے بعض تو وہ تھے جن کے جہل کی گواہی خود قرآن مجید نے دی، ارشاد ہے:

{تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ★ مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ} (اللھب: ٢-١)۔

(ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ تباہ ہو ہی چکا، نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی)۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں ابولہب کے لیے صاف صاف ہلاکت کی بات کہی۔ اسی طرح مدینہ منورہ میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جنھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ہم کو کسی بھی صورت میں ماننا نہیں ہے، اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔ فرمایا:

{إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ . عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ}۔

(یقینا وہ لوگ جنھوں نے انکار ہی طے کرلیا ہے، ان کے لیے برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ نہ مانیں گے۔)

ان لوگوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ آپ ﷺ چاہے کیسے ہی دلائل لے آئیں لیکن ان کو نہیں ماننا ہے، سیرت میں آتا ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ سے مطالبے کیے کہ آپ مردوں کو زندہ کردیں، خاص طور سے قصی بن کلاب کو ضرور زندہ کریں تاکہ وہ آپ پر ایمان لائے اور آپ کی بات مانے، انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ آپ دعا کرکے ہمارے لیے نہریں جاری کروادیں اور پہاڑوں سے ہمیں دشواری ہوتی ہے ان کو ہٹوا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ یہ بات ارشاد فرمائی کہ اگر ان سب مطالبات کو پورا کردیا جاتا تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

{وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَآئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلاً مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ} (الأنعام: ١١١)

(اور اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھی اتار

دیتے اور مردے ان سے گفتگو کرتے اور ہر چیز لاکر ہم ان کے سامنے کردیتے، تب بھی وہ ہرگز ایمان نہ لاتے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کی مشیت ہوتی لیکن ان میں زیادہ تر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں)۔

یہ بھی ایک لطیفہ تھا کہ اگر مشرکین کے کسی مطالبہ کو پورا کردیا جاتا تو پھر وہ اس کی تاویلیں کرنے لگ جاتے تھے، ظاہر ہے جن کو ماننا نہیں ہوتا ان کے پاس دسیوں تاویلیں ہوتی ہیں، اس آیت میں انہی لوگوں کا تذکرہ ہے جس میں مکہ مکرمہ کے کفار وہٹ دھرم مشرکین بھی مراد ہیں جنھوں نے طے کرلیا تھا کہ نہیں ماننا ہے اور اس سے مدینہ طیبہ کے وہ یہود بھی مراد ہیں جنھوں نے پوری طرح سے جاننے کے باوجود یہ طے کرلیا تھا کہ آپ ﷺ کو نہیں ماننا ہے۔ بہت کم یہودی ایسے ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا، ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ الفاظ آتے ہیں:

{فَلاَ يُؤْمِنُونَ إِلاَّ قَلِيلاً} (تو بہت ہی کم وہ ایمان لاتے ہیں۔)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ عنہ، حضرت مخیریق بن نضیرؒ وغیرہ چند حضرات مسلمان ہوئے، تاہم عام طور پر یہودیوں کے مزاجوں میں ہٹ دھرمی تھی، ان کا یہ مزاج ہمیشہ کا رہا ہے، انھوں نے انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا، ان کے سروں پر آرے چلائے، ان کی تکذیب کی اور نہ جانے کتنوں کو مار ڈالا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں نبیوں کے ساتھ ان کے اس سلوک کا ذکر بھی کیا ہے، اسی لیے یہاں یہ بات کہی گئی کہ ان کو ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے ان پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں، یہ تو اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں۔

اس آیت میں آپ ﷺ کو ایک طرح سے تسلی بھی دی جارہی ہے، آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ آپ کے اندر کی خواہش تھی کہ سب لوگ مسلمان ہوجائیں، قرآن مجید میں آپ ﷺ کے اس حال کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

{فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً} (الکھف: ٦) (بس اگر انھوں نے یہ بات نہ مانی تو لگتا ہے کہ آپ ان کے پیچھے اپنی جان ہلکان کردیں گے)۔

آپ ﷺ کی تمنا یہ تھی کہ سب لوگ مسلمان ہوجائیں لیکن اللہ نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں، اس دنیا میں کچھ لوگ وہ بھی ہیں جنھوں نے نہ ماننا طے کرلیا تو آپ دل گیر نہ ہوں، اللہ نے ایسے ہٹ دھرموں کے لیے جہنم لکھ دی ہے، ان کو جہنم رسید ہونا ہے اور وہ یہی چاہتے ہیں۔

اس آیت میں ایک نظام بھی بتایا جارہا ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، ان کے علاوہ جو لوگ ہیں ان تک پہنچنے کی کوشش کیجیے اور انہیں دعوت دیجیے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے گا تو وہ ایمان لے آئیں گے۔

☆☆☆

انسانی حقوق کی پامالی اور آزادیٔ رائے

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

مسلمان دنیا کے مختلف گوشوں میں جن مصائب ومشکلات کا سامنا کررہے ہیں، اور جس طرح ان کے حقوق پامال کیے جارہے ہیں اور ان کے دینی شعائر اور مقدسات کی توہین کرکے ان کے جذبات کو مجروح کیا جارہا ہے، یہ سب سیاست دانوں اور میڈیا سے مخفی نہیں ہے؛ لیکن ان پامالیوں پر اقوام متحدہ اور اس کی ایجنسیاں اور تنظیمیں خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں، حالات وواقعات شاہد ہیں کہ حقوق انسانی کا عالمی منشور جاری ہونے کے بعد ہی سے مسلمانوں کی عزت وآبرو سے کھلواڑ کیا جارہا ہے، ان کے حقوق دبائے جارہے ہیں، ان کے علاقوں پر قبضہ کیا جارہا ہے، ان کا شیرازہ منتشر کیا جارہا ہے اور ان کے گھروں کو مسمار کیا جارہا ہے اور مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں انسانی المیوں سے دوچار ہیں، ان کے عقائد ومسلمات کی توہین کی جارہی ہے، ان کی تہذیب وثقافت اور مقدس مقامات پر حملے کیے جارہے ہیں۔ دنیا میں انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے بہت سی تنظیمیں قائم ہیں؛ لیکن یہ تنظیمیں مسلمانوں کے تعلق سے غیر مؤثر ثابت ہوئی ہیں، عالمی میڈیا حقائق کو چھپانے کا کام کرتا ہے یا ان حملوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تاویلیں پیش کرتا ہے، نیز اسلام اور مسلمانوں سے نفرت پیدا کرنے کے وسائل اختیار کیے جارہے ہیں اور ان کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹے الزام تراشے جارہے ہیں، لیکن اس سب کو انسانی حقوق کی پامالی اور خلاف ورزی نہیں کہا جاتا؛ بلکہ آزادیٔ رائے کی بنیاد پر سب جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔ ☆☆

تعلیم الحدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ

مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ الْجَدَلِيِّ، قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا عَنْ خُلُقِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ: لَمْ يَكُنْ فَاحِشًا، وَلَا مُتَفَحِّشًا، وَلَا صَخَّابًا فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ، وَلٰكِنْ يَعْفُو وَيَصْفَحُ۔ (رواہ الترمذي:۲۰۱۶)

ترجمہ: ابوعبداللہ جدلی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نہ طبعی طور پر فحش گو تھے، نہ تکلف کے ساتھ فحش گوئی کرتے تھے، نہ بازاروں میں شور وغل مچانے والے تھے، اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے، بلکہ معاف فرمادیتے اور درگزر فرماتے تھے۔

تشریح: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کا نہایت جامع تعارف پیش کرتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، جو آپ ﷺ کی گھریلو زندگی کی سب سے بڑی شاہد تھیں، انہوں نے چند جملوں میں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی وہ تصویر کھینچ دی ہے جس میں زبان، معاشرت، معاملات اور دشمنوں کے ساتھ برتاؤ، سب شامل ہیں۔

لَمْ يَكُنْ فَاحِشًا، وَلَا مُتَفَحِّشًا یعنی آپ ﷺ نہ فطری طور پر بدزبان تھے، نہ قصداً اور بناوٹ کے ساتھ فحش کلامی اختیار کرتے تھے۔

"وَلَا صَخَّابًا فِي الْأَسْوَاقِ" یعنی آپ ﷺ بازاروں میں چیخنے، چلانے، جھگڑنے یا شور مچانے والے نہ تھے۔ بازار انسانی معاملات، لین دین اور اختلافات کی جگہ ہوتے ہیں، لیکن وہاں بھی آپ ﷺ نے ہمیشہ وقار، حلم اور سکون کو اختیار فرمایا "وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ" یعنی جو شخص آپ کے ساتھ برائی کرتا، آپ اس کے جواب میں برائی نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ انتقام کے بجائے اصلاح کو، اور غصے کے بجائے حلم کو اختیار فرماتے۔ لٰكِنْ يَعْفُو وَيَصْفَحُ یعنی آپ ﷺ معاف بھی فرماتے تھے اور دل سے درگزر بھی کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں تیرہ برس تک کفار نے آپ ﷺ کو جھٹلایا، ایذائیں پہنچائیں، گالیاں دیں، پتھر مارے، معاشرتی بائیکاٹ کیا، یہاں تک کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ لیکن جب فتح مکہ کے دن وہی لوگ آپ ﷺ کے سامنے بے بس کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے انتقام لینے کے بجائے ان کو معافی کا پروانہ عطا فرمادیا۔ یہ ولٰكِنْ يَعْفُو وَيَصْفَحُ کی عملی تفسیر تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے حلم و بردباری کی ایک نہایت مؤثر مثال زید بن سعنہ، جو ایک یہودی عالم تھے، کے واقعے میں ملتی ہے۔ ایک مرتبہ وہ قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے لیے آپ ﷺ کے پاس آئے، حالانکہ ادائیگی کی مدت ابھی باقی تھی۔ انہوں نے نہایت سخت لہجے میں آپ ﷺ کی چادرِ مبارک کھینچ کر کہا: "اے محمد! میرا حق ادا کیجیے، اللہ کی قسم! میں تو بنی عبدالمطلب کو ٹال مٹول کرنے والا جانتا ہوں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ گستاخانہ انداز دیکھ کر سخت برہم ہوگئے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے نہ غصے کا اظہار فرمایا، نہ سخت جواب دیا اور نہ آواز بلند کی، بلکہ نہایت سکون سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "عمر! ہمیں تم سے اس بات کی زیادہ ضرورت تھی کہ تم مجھے اچھے طریقے سے قرض ادا کرنے کی نصیحت کرتے اور اسے اچھے طریقے سے مطالبہ کرنے کی تلقین کرتے۔"

پھر آپ ﷺ نے اس کا قرض ادا کرنے کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی کی تلافی کے طور پر کچھ زائد کھجوریں بھی دینے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کے اس بے مثال حلم، عفو اور حسنِ اخلاق سے متاثر ہوکر زید بن سعنہ نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ حلم، نرمی اور حسنِ سلوک سے دلوں کو فتح فرماتے تھے۔

(ابن حبان: ۲۸۸)

فائدہ: آج معاشرے میں گفتگو میں تلخی، اختلاف میں بدزبانی اور معمولی باتوں پر انتقام کا جذبہ عام ہوتا جارہا ہے۔ یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حقیقی اتباع صرف عبادات میں نہیں بلکہ زبان، معاملات، برداشت، عفو و درگزر اور حسنِ اخلاق میں بھی ہے۔ جو شخص اپنی زبان کو پاکیزہ رکھے، غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے، اور قدرت کے باوجود معاف کر دے، وہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق سے اپنا تعلق مضبوط کرتا ہے۔ یہی وہ اخلاق ہیں جو دلوں کو جیتتے، معاشروں میں محبت پیدا کرتے اور اسلام کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

تعلیم الفقہ

سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: آج کل بہت سی دکانوں میں تجارت کو بڑھانے کے لیے ڈرا کوپن دیے جاتے ہیں، ہوتا یہ ہے کہ جو چیز خریدی جاتی ہے، وہ تو گاہک کو دیتے ہی ہیں، اس کے ساتھ ایک کوپن بھی دیتے ہیں، اگر قرعہ اندازی میں کوپن کے ذریعے گاہک کا نام نکل جائے، تو اسے خصوصی انعام دیا جاتا ہے، کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب: اگر گاہک کو خریدی ہوئی چیز مل جاتی ہے اور بیچنے والا قرعہ اندازی کی بنیاد پر کسی گاہک کو اپنی طرف سے انعام دیتا ہے، تو یہ جائز ہے، گویا وہ اضافی چیز ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ خرید وفروخت کا معاملہ طے ہونے کے بعد اگر فروخت کنندہ خریدار کو مزید اضافی چیز دے تو یہ شرعاً جائز ہے۔

”ویجوز للبائع ان یزید للمشتري في المبیع“۔[مختصر القدوری، ص۸۱]

سوال: بہت دفعہ لوگوں سے گاہک ایک شے کو نقد قیمت میں طے کر لیتا ہے، بعد میں کئی کئی دن تک پیسے لاکر نہیں دیتا، ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ہم سامان روک سکتے ہیں؟

جواب: اگر قیمت نقد طے ہوئی ہو معاملہ کے وقت ادھار کی بات نہیں ہوئی ہو، تو فروخت کرنے والے سامان روکے رہیں اور جب تک قیمت ادا نہ ہو جائے فروخت شدہ سامان حوالہ نہ کریں۔

”للبائع حق حبس المبیع لاستیفاء الثمن و اذا کان حالات“۔[فتاویٰ ہندیہ:۱۵/۵]

سوال: آج کل بلڈنگ ڈیولپمنٹ کا کام اس طرح ہوتا ہے کہ زمین ایک شخص کی ہوتی ہے، اور دوسرا شخص اس پر بلڈنگ بناتا ہے، اور طے پاتا ہے کہ تعمیر کے بعد مثلاً چالیس فلیٹس مالک زمین کے اور ساٹھ بلڈر کے ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے حصہ کے فلیٹس فروخت کرنے کے مجاز ہوں گے؟ کیا اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب: اس میں مالک زمین اپنی زمین فلیٹس کے عوض فروخت کرتا ہے، اور بلڈر فلیٹس اسے بطور قیمت دیتا ہے، جیسے روپیے سے کوئی چیز خریدی جا سکتی ہے، اسی طرح سامان کی سامان کے بدلہ بھی فروخت ہو سکتی ہے، شرع اسلامی میں اس کی اجازت ہے، شرعی نقطۂ نظر سے یہ معاملہ (خرید وفروخت کے معاملہ) کے دائرہ میں آتا ہے کیونکہ مشہور محقق ابن ہمام نے کہا:

”ھو مبادلة المال بالمال بالتراضی بطریقة الاکتساب“۔[فتح القدیر:۲۲۹/۶]

سوال: ایک ضلع سے دوسرے اضلاع بینک میں رقم ٹرانسفر ہوتی ہے، اس کے عوض بینک کمیشن کاٹتا ہے، کیا یہ جائز ہے، سود تو نہیں ہے؟

جواب: ایک مقام سے دوسرے مقام پر رقم منتقل کرنے کا کمیشن سود نہیں ہے، یہ گویا اس عمل کی اجرت ہے، اس لیے اس طرح رقم منتقل کرانا اور رقم کی منتقلی پر اجرت ادا کرنا جائز ہے۔

سوال: ایک مکان کا بیعانہ ہوا، دس لاکھ روپے قیمت طے پائی، ادائیگی کی مدت تین ماہ قرار پائی، اگر اس درمیان فروخت کنندہ نے کسی اور کو یہی مکان بارہ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا تو کیا یہ جائز ہوگی؟

جواب: جب مکان کی خرید و فروخت کا معاملہ طے ہو گیا، قیمت بھی طے پا گئی اور ادائیگی کی مدت بھی، تو اب مشتری اس مکان کا مالک باقی نہیں رہا وہ اس میں اپنے طور پر کوئی تصرف نہیں کر سکتا ہے، اس لیے اسے بارہ لاکھ یا اس سے زیادہ یا دس لاکھ سے کم میں کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دینا جائز نہیں ہے۔[فتح القدیر:۲۳۹/۶]

سوال: سعودی عرب سے کچھ فری ویزے نکلتے ہیں، اگر ایسے ویزے کسی کو مل جائیں، اور وہ اپنی طرف سے قیمت طے کر کے ویزے کے پیسے لیں، تو کیا یہ عمل درست ہوگا؟

جواب: جو ویزے مفت نکلتے ہوں اور سعودی حکومت کی جانب سے فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہو، تو اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، یہ رشوت کے حکم میں ہے اور اس کا لینا حرام ہے، البتہ دفتری اور قانونی کارروائی کے عوض جو اجرت مروج ہے، اس کے بقدر پیسے لیے جا سکتے ہیں۔

سوال: مکان فروخت کرتے وقت جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ پورا نہیں کیا گیا تو خریدار کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اگر مکان کے بارے میں تمام تفصیلات طے پا گئی تھیں، مگر مکان مالک نے اس کی پوری رعایت نہیں کی، تو اب خریدار کے لیے دو باتوں کی گنجائش ہے، ایک یہ کہ خریدار معاملہ ختم کر دے اور دی گئی رقم واپس لے لے۔

دوسری صورت ”رجوع بالنقصان“ کی ہے، یعنی طے شدہ معاملہ کے اعتبار سے جو کمی پائی جائے، وہ ایک طرح کا عیب ہے، لہٰذا عیب زدہ ہونے کی صورت میں فروخت کنندہ اس کا عوض ادا کر دے، البتہ اس نقصان کا اندازہ ماہرین کے مشورہ پر کیا جائے گا۔

☆☆☆

تاریخ ہند

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار
اور تعمیرِ وطن میں ہماری ذمہ داریاں

ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی (معتمد مال ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ہر قوم کی زندگی میں کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ ۱۵/ اگست بھی ہندوستان کی تاریخ کا ایسا ہی ایک یادگار دن ہے۔ اسی دن ۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوا۔ یہ آزادی ہمیں آسانی سے حاصل نہیں ہوئی؛ بلکہ لاکھوں لوگوں کی قربانیوں، بے شمار جدوجہد اور طویل صبر کے بعد ملی۔ اسی لیے یومِ آزادی صرف جشن منانے کا دن نہیں؛ بلکہ اپنے ماضی کو یاد کرنے، حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے کا دن بھی ہے۔

آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک آزاد قوم ہی اپنے فیصلے خود کرسکتی ہے، اپنی تہذیب اور ثقافت کو محفوظ رکھ سکتی ہے اور اپنی ترقی کا راستہ خود منتخب کرسکتی ہے۔ اس لیے ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے اور ہمیشہ ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے جنھوں نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔

ہندوستان کی سرزمین صدیوں سے مختلف تہذیبوں، مذاہب اور ثقافتوں کا گہوارہ رہی ہے، اس کی مٹی میں بے شمار شہیدوں کا خون شامل ہے جنھوں نے آزادی، عزت اور انصاف کی خاطر اپنی جانیں قربان کردیں، آزادی کسی قوم کو تحفہ میں نہیں ملتی؛ بلکہ اس کے لیے نسلوں کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ہندوستان کی آزادی کی تاریخ بھی ایسے ہی بے شمار ایثار، صبر، استقامت اور قربانیوں کا خوبصورت استعارہ ہے، جن میں ہر مذہب، ہر زبان اور ہر خطہ کے لوگوں نے حصہ لیا، مسلمانوں نے بھی اس جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے دین کے اس اصول پر عمل کیا کہ ظلم وجبر کے مقابلے میں حق وانصاف کا ساتھ دینا ایمان کا تقاضا ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک محض ۱۹۴۷ء تک محدود نہیں؛ بلکہ اس کی بنیادیں اس سے بہت پہلے پڑ چکی تھیں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی سیاسی گرفت مضبوط کررہی تھی تو بہت سے علماء، مجاہدین اور عوام نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہندوستان کی تاریخ کا عظیم باب ہے، اس جدوجہد میں ہندو، مسلمان اور سکھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوئے، اس تحریک کی علامت آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بنے، جنھیں اگرچہ سیاسی اختیار حاصل نہ تھا؛ لیکن وہ قومی اتحاد کی علامت تھے۔ دہلی، لکھنؤ، کانپور، جھانسی، بریلی، فیض آباد اور ملک کے دیگر علاقوں میں لاکھوں لوگوں نے آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔

علمائے کرام نے بھی اس تحریک میں بھرپور کردار ادا کیا، مولانا فضلِ حق خیرآبادیؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا اور اس جرم میں انھیں قید وجلاوطنی کی سخت سزائیں برداشت کرنا پڑیں، مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادیؒ نے عوام کو آزادی کے لیے منظم کیا اور میدانِ جنگ میں اپنی جان قربان کی، بعد کے ادوار میں دارالعلوم دیوبند سے وابستہ متعدد علماء نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا، جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور ان کے رفقاء نمایاں ہیں، ان کی ریشمی رومال تحریک اور دیگر کوششوں نے آزادی کے جذبہ کو زندہ رکھا۔

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ نے علمی، سیاسی اور فکری قیادت فراہم کی، ان کی تقریریں اور تحریریں قومی اتحاد، تعلیم اور آزادی کا پیغام دیتی تھیں، خان عبدالغفار خان نے عدم تشدد، اخلاق اور خدمتِ خلق کے ذریعے آزادی کی تحریک کو نئی قوت بخشی، ان کی خدائی خدمت گار تحریک ایثار اور نظم وضبط کی روشن مثال تھی۔

مسلمانوں نے صرف ہتھیار اٹھا کر ہی قربانی نہیں دی؛ بلکہ اپنی جان، مال، عزت، علم، قلم اور آزادی سب کچھ اس وطن کے لیے پیش کیا، بہت سے علماء کو پھانسی دی گئی، ہزاروں کو کالا پانی بھیجا گیا، بے شمار خاندان اجڑ گئے، مدارس اور املاک ضبط ہوئیں؛ لیکن آزادی کا چراغ بجھنے نہ دیا گیا۔

یہ قربانیاں کسی ایک مذہب یا طبقے کے لیے نہیں؛ بلکہ پورے ہندوستان کی آزادی، عزت اور مستقبل کے لیے تھیں، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مشترکہ قومی جدوجہد اور قومی یکجہتی کی تاریخ ہے۔

جنگِ آزادی کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ

قومیں اتحاد، قربانی، کردار اور اعلیٰ اخلاق سے زندہ رہتی ہیں۔ مذہبی، لسانی یا علاقائی اختلافات اگر قومی مفاد پر غالب آجائیں تو قومیں کمزور ہوجاتی ہیں؛ لیکن جب انصاف، باہمی احترام اور وطن کی محبت مشترک مقصد بن جائے تو ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

آج ہمارے سامنے میدانِ جنگ نہیں؛ بلکہ میدانِ عمل نیز تشکیل وتعمیر ہے، اب ہمیں تلوار نہیں؛ بلکہ علم، کردار، دیانت، محنت اور خدمت کے ذریعہ ملک کو مضبوط بنانا ہے۔

ہندوستان اپنی گوناگوں ثقافت، مختلف زبانوں، مذاہب اور رسم ورواج کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہاں مختلف عقائد کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اور یہی ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ اتحاد، بھائی چارہ، محبت اور باہمی احترام ہی ایک مضبوط اور خوشحال ملک کی بنیاد ہیں۔ اگر ہم ان اقدار کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں تو ہمارا ملک مزید ترقی کرے گا۔

آج ہندوستان تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی، زراعت، طب، کھیل اور خلائی تحقیق کے میدان میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ترقی ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے؛ لیکن اس ترقی کو برقرار رکھنے اور مزید آگے لے جانے کی ذمہ داری صرف حکومت پر نہیں، بلکہ ہر شہری پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جب ہر شخص اپنا فرض دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کرے تو قومیں ترقی کی نئی منزلیں طے کرتی ہیں۔

یومِ آزادی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ آزادی کی حفاظت صرف سرحدوں پر کھڑے سپاہی ہی نہیں کرتے؛ بلکہ ہر وہ شہری کرتا ہے جو اپنے کردار، اپنے علم، اپنی محنت اور اپنی دیانت سے ملک کی خدمت کرتا ہے۔ ایک طالب علم کی محنت، ایک استاد کی لگن، ایک کسان کی مشقت، ایک ڈاکٹر کی خدمت اور ایک مزدور کی ایمانداری، سب مل کر ایک مضبوط اور خوشحال ہندوستان کی تعمیر کرتے ہیں۔

طلبہ کسی بھی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ آج کے طالب علم ہی کل کے ڈاکٹر، انجینئر، استاد، سائنس دان، فوجی افسر، جج، تاجر اور رہنما بنیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کریں، وقت کی قدر کریں، سچائی، ایمانداری اور نظم وضبط کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں اور اپنے والدین واساتذہ کا احترام کریں۔ یہی عادتیں انہیں ایک کامیاب انسان اور ایک ذمہ دار شہری بنائیں گی۔

ملک سے محبت صرف قومی پرچم لہرانے یا نعرے لگانے کا نام نہیں۔ سچی حب الوطنی یہ ہے کہ ہم اپنے فرائض پوری ایمانداری سے ادا کریں، قانون کی پابندی کریں، صفائی کا خیال رکھیں، ماحول کی حفاظت کریں، دوسروں کے حقوق کا احترام کریں اور معاشرے میں امن، محبت اور بھائی چارے کو فروغ دیں۔ جب ہر شہری اپنی ذمہ داری سمجھے گا تو ملک خود بخود ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔

ہماری اہم ذمہ داریاں یہ ہیں: آئین اور قانون کا احترام کرنا۔ ملک کے امن، اتحاد اور بھائی چارہ کو فروغ دینا۔ تعلیم، تحقیق، سائنس اور ٹیکنالوجی میں نمایاں کردار ادا کرنا۔ دیانت داری، امانت داری اور حسنِ اخلاق کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا۔ نفرت، تشدد، جھوٹ اور افواہوں سے بچنا۔ غریبوں، کمزوروں اور ضرورت مندوں کی خدمت کرنا۔ ماحولیات، صفائی اور عوامی املاک کی حفاظت کرنا۔ اختلاف کے باوجود باہمی احترام اور مکالمے کی روایت کو زندہ رکھنا۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ہم اپنے بزرگوں کی قربانیوں کا حقیقی حق ادا کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی لاکھوں شہیدوں کی امانت ہے، اس امانت کی حفاظت صرف سرحدوں کی حفاظت سے نہیں؛ بلکہ انصاف، تعلیم، اتحاد، محنت، اخلاق اور خدمت کے ذریعے ہوتی ہے، مسلمانوں سمیت اس ملک کے تمام باشندوں نے آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں، اس لیے آزادی کی حفاظت اور ملک کی ترقی بھی سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

کہا گیا ہے اور بالکل سچ کہا گیا ہے کہ: ”قومیں اپنے ماضی کی قربانیوں کو یاد رکھ کر، حال میں محنت کر کے اور مستقبل کے لیے امید کے چراغ روشن کر کے ہی عظمت کی منزلیں طے کرتی ہیں۔“

آئیے! اس یومِ آزادی پر ہم سب یہ عہد کریں کہ ہم اپنے وطن سے محبت کریں گے، قانون کا احترام کریں گے، اتحاد اور بھائی چارہ کو فروغ دیں گے، تعلیم اور اچھے اخلاق کو اپنی زندگی کا حصہ وشعار بنائیں گے، اور اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو یاد رکھتے ہوئے اپنی محنت وکردار سے ہندوستان کو مزید ترقی یافتہ، مضبوط، خوشحال اور باوقار ملک بنانے میں اپنا بھرپور مثبت کردار ادا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے وطن ہندوستان کو ہمیشہ امن، ترقی، خوشحالی اور بھائی چارے کی نعمتوں سے مالا مال رکھے، آمین۔

☆☆☆

ایک جائزہ

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگیں اور ان کے اثرات

مولانا محمد شعیب ندوی (جامعہ امداد العلوم پرتاپ گڑھ، یوپی)

پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی سیرت و کردار اور آپ کے تمام اعمال وافعال میں سب سے نمایاں وصف آپ کی ”رحمۃ للعالمین“ ہونا ہے، جس کا اظہار واعلان خالقِ کون ومکاں نے اس طرح فرمایا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء: ۱۰۷) اے رسول! ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کے اس عظیم وصف کا مظاہرہ آپ کی تعلیمات وہدایات اور آپ کے تمام میدانِ عمل، حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں بھی نمایاں طور پر ہوا۔ آپ کی شانِ رحمت ورأفت، رحم وکرم، حلم وعفو کی مثالیں جس طرح اور جتنی بڑی تعداد میں عام حالاتِ زندگی اور اپنوں کے ساتھ ملتی ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے نمونے میدانِ جنگ اور معرکۂ کارزار میں اپنے جانی دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے ساتھ آپ کی حیاتِ طیبہ میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

غزوۂ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا بھی اسی شانِ رحمۃ للعالمینی کا مظہر تھا۔ فتحِ مکہ کے دن اہلِ مکہ کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کرنے کی مثال کیا تاریخ انسانی میں کہیں پیش کی جاسکتی ہے؟ جس شہر کے لوگوں نے تیرہ برس تک رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ پر ظلم وستم ڈھایا تھا، اسی شہر میں آپ کا فاتحانہ داخلہ اس شان سے ہوا کہ آپ کا سر خدا کے آگے جھکا جارہا تھا، آپ کی پیشانی اونٹ کے کجاوے سے لگی جارہی تھی، اور آپ کے طرزِ عمل میں غرور وتکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہی لوگ جو تیرہ برس تک آپ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے رہے، جنہوں نے ہجرت پر مجبور کیا تھا، اور جو ہجرت کے بعد بھی آٹھ برس تک آپ سے برسرِ جنگ رہے تھے، ایسے شہر اور ایسے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، مگر کوئی قتلِ عام نہیں کیا جاتا، کسی قسم کی لوٹ مار نہیں کی جاتی، کسی کی جان ومال، عزت وآبرو سے تعرض نہیں کیا جاتا، پرانے اور کٹر دشمنوں پر انتقام کا کوئی ہاتھ نہیں اٹھتا۔ سالارِ فوج داخلہ سے پہلے اعلان کر دیتا ہے کہ جب تک تم پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے، تم بھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی منادی کی جاتی ہے کہ جو کوئی اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے گا، اسے امان ہے، جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، اسے امان ہے۔ پھر فتح مکمل ہونے کے بعد فاتح سردار کے سامنے وہ سارے دشمن گردنیں جھکائے ہوئے آکر کھڑے ہوتے ہیں۔ فاتح پوچھتا ہے کہ اب تم کیا امید رکھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ وہ شرمساری کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ آپ فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے بیٹے ہیں۔ اس رحمت عالم ﷺ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے: ”جاؤ، تم سب آزاد ہو، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔“

دشمنانِ اسلام نے پیغمبر اسلام ﷺ کی جنگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ پر قتل وغارت گری کے الزامات لگائے ہیں اور آپ کی تعلیمات میں انہیں یہی پہلو زیادہ نظر آتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جو جنگیں لڑیں، وہ امن وامان قائم کرنے کے لیے تھیں۔ نہ آپ نے جبر واکراہ سے کسی کو اپنے مذہب میں داخل کیا اور نہ ناحق کسی کا خون بہایا گیا، بلکہ جنگ، جس کو اسلام کی اصطلاح میں ”جہاد فی سبیل اللہ“ کا نام دیا گیا، اس کا مقصد اتنا ارفع واعلیٰ کر دیا گیا کہ کسی دنیاوی غرض کا شائبہ بھی باقی نہیں رہنے دیا گیا۔

داعیٔ اسلام ﷺ نے جنگ کے مقصد کو بالکل صاف اور واضح انداز میں بیان فرمایا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا گیا جو بہادری دکھانے کے لیے جنگ کرتا ہے، یا قومی یا وطنی حمیت کے لیے جنگ کرتا ہے، یا شہرت وناموری کے لیے جنگ کرتا ہے۔ تو فرمائیے! کس کی جنگ راہِ خدا میں ہے؟ حضور پاک ﷺ نے جواب دیا کہ راہِ خدا کی جنگ صرف اسی شخص کی ہے جو محض اس لیے جنگ کرے کہ اللہ کے کلمہ کا بول بالا ہو جائے۔

اس کے علاوہ متعدد ہدایات و واقعات ہیں جن سے اس مقصدِ بلند کی صاف صاف وضاحت ہوتی ہے، اور دوسری طرف رہبر انسانیت ﷺ نے جنگوں کو تمام وحشیانہ اعمال وافعال سے بالکل پاک وصاف فرما دیا۔ چنانچہ آپ نے بچوں، بوڑھوں، عورتوں، بیماروں، خانقاہ نشین زاہدوں، معبدوں اور مندروں کے پجاریوں اور ایسے دوسرے بے ضرر لوگوں کو قتل کرنے سے سختی سے منع فرمایا۔ نیز دشمن پر غفلت میں حملہ کرنے، آگ میں جلانے، لوٹ مار کرنے، فصلوں اور پھل دار درختوں کو کاٹنے اور تباہ وبرباد کرنے، لاشوں کا مثلہ کرنے، سفیروں کو قتل کرنے اور بدعہدی کرنے

کو ناجائز اور غیر اسلامی عمل قرار دیا، بلکہ جب آپ کے سامنے اس طرح کے بعض واقعات کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے سخت غم وغصہ کا اظہار ہی نہیں، بلکہ اس سے اپنی براءت کا اعلان بھی فرمایا۔

یہ تعلیمات و ہدایات صرف کاغذ کے صفحات پر خالی قراردادیں اور اسکیمیں نہ تھیں، بلکہ ان اصلاحی و انقلابی تعلیمات کا نمونہ سیرت کے ایک ایک ورق پر ملتا ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی کا جائزہ لیا جائے، جس میں غزوات وفتوحات کے دور کا آغاز ہوتا ہے، اور ان اعداد وشمار کو غور سے دیکھا جائے کہ ان جنگوں کی تعداد، جن میں بذاتِ خود آپ نے شرکت فرمائی، اور وہ لڑائیاں جن میں آپ نے خود شرکت نہیں فرمائی بلکہ وقتاً فوقتاً کبھی کم کبھی زیادہ تعداد میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فوجیں بھیجیں، جن کو "سریہ" کہا جاتا ہے، ان سب کی تعداد ملا کر مشہور سیرت نگاروں کے مطابق بیاسی (۸۲) ہے۔ ان سب میں طرفین کے مجموعی نقصانات کا جو نقشہ انہوں نے پیش کیا ہے، اس کے مطابق کل قیدیوں کی تعداد ۶۵۶۵ زخمیوں کی تعداد ۱۲۷ اور مقتولین کی تعداد ۱۰۱۸ ہے۔

اب آپ اس نقشے سے قیدیوں کی تعداد کو الگ کر دیجیے، کیونکہ ان میں سے اکثر قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا، یا وہ اسلامی تعلیمات، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے بلند اخلاق سے متاثر ہو کر حلقۂ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ آپ صرف طرفین کے زخمیوں اور مقتولوں کی تعداد پر نظر ڈالیں، وہ ۱۱۱۴ ہے۔ کیا چھوٹی بڑی ۸۲ جنگوں میں یہ تعداد کچھ اہمیت رکھتی ہے؟ کیا آج ایک ہی شہر میں معمولی فسادات میں اس سے زیادہ جانیں ضائع نہیں ہو جاتیں؟

لیکن پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ جہاں جہاں اسلام کی روشنی پھیلتی جاتی تھی اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کے قدم پڑتے جاتے تھے، ظلم وستم کافور ہو گیا، امن وامان، چین وسکون، شرافت و انسانیت، عدل و انصاف، ہمدردی و خیر خواہی کے حقیقی مفہوم سے انسانیت آشنا ہو گئی، اور قتل وغارت گری، لوٹ مار کا خاتمہ ہو گیا۔ الغرض شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پینے لگے، جو تاریخ کا ایک سنہرا، نرالا اور معیاری دور قرار پایا۔

دس برس کے اندر پورے ملکِ عرب میں مکمل امن وامان قائم ہو گیا، قبائل کی خانہ جنگیاں ختم ہو گئیں، جرائم کا بازار سرد پڑ گیا، خدا کا یقین اور آخرت کا خوف عوام کی زندگیوں کا نشانِ راہ بن گیا۔ خلوت وجلوت کے تمام معاملات میں وہ اللہ کی حاضر و ناظر ذات کو ذہن و دماغ میں بسائے رکھتے تھے۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس میں امن قائم رکھنے کے لیے پولیس اور سی آئی ڈی کی حاجت نہیں رہ گئی تھی۔ جرائم مفقود ہو گئے تھے، اور اگر کسی سے کوئی جرم سرزد بھی ہو جاتا تھا تو وہ خود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اقرار کر لیتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بشارت دی تھی کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ صنعاء سے حجاز تک ایک خاتون تنہا سفر کرے گی اور اسے خدا کے علاوہ کسی کا خوف نہیں ہوگا۔ لوگ اس پر تعجب کرتے تھے کہ جس ملک میں بڑے بڑے قافلے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر پاتے، وہاں پردہ نشین عورت کو اتنا اطمینان بھلا کہاں نصیب ہوگا؟ لیکن چند ہی سالوں بعد حضرت عدی بن حاتمؓ نے گواہی دی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق ایک عورت صنعاء سے حجاز تک تنہا سفر کرتی تھی اور راستے میں اسے کسی طرح کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔

سید امیر علی کہتے ہیں: "ان چند برسوں نے واقعی کیسا انقلاب دیکھا تھا! یقیناً جنت کا کوئی فرشتہ ملک سے ہو کر گزر گیا تھا جس نے ان لوگوں کے قلوب میں محبت اور لطافت کا جادو پھونک دیا تھا، جو اس وقت نیم درندگی کی انتہائی قابلِ نفرت پستیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ لاقانونیت کا وہ جنگل، جہاں تمام خدائی اور انسانی قوانین بلا جھجھک جھٹلائے اور توڑے جاتے تھے، گلزار بن گیا۔"
(مقالاتِ سیرت، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، ص ۱۸۵)

اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ کیا ایسے نبی کے دامن پر قتل و غارت گری کا داغ لگانا اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو دہشت گردی کی بنیاد قرار دینا عقل و انصاف کی بات ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی ایسا فاتح، کوئی ایسا لیڈر، کوئی ایسا قائد وسپہ سالار دنیا کی تاریخ میں گزرا ہے جس کی فتوحات سے دنیا نے ایسی بہاریں دیکھی ہوں، اور نسیمِ ہدایت کے ایسے جھونکے چلے ہوں، اور انسانوں کو ایسا امن و امان، چین وسکون میسر آیا ہو، اور جس کی فتوحات کی برکتیں اتنی ہمہ گیر، وسیع و عمیق، روشن اور تابناک ہوں جتنی اس فاتحِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فتوحات کو حاصل ہوئیں؟

اب آپ غور کریں، دنیا میں بے شمار جنگیں ہو چکی ہیں اور آج بھی ہو رہی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان جنگوں سے، جن میں ہزاروں لاکھوں انسان مارے جاتے ہیں، ملک کی بے پناہ دولت لٹائی جاتی ہے، کتنے آباد وشاداب شہر ویرانوں میں اور گلزار بستیاں کھنڈروں اور راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، انسانیت کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

فکرونظر

مغرب اور اسرائیل کا میکیاویلی نظریہ

ایک تنقیدی جائزہ

مولانا محمد فرمان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

چند ماہ قبل امریکہ اور اسرائیل کی جانب سے شروع ہونے والی جنگ کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، دونوں فریقوں کے درمیان صلح و مصالحت کے باوجود جنگ کی آگ مسلسل بھڑکتی رہتی ہے، جب بھی دونوں فریقوں کے درمیان صلح صفائی اور جنگ بندی کا کوئی معاہدہ طے پاتا ہے، تو کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس طویل جنگ کا ایک مرحلہ ۱۳ جون ۲۰۲۵ء سے شروع ہوا، جو بارہ دن تک جاری رہا اور ۲۴ رجون ۲۰۲۵ء کو ختم ہوا۔ اس کے بعد اس جنگ کا دوسرا مرحلہ ۲۸ رفروری ۲۰۲۶ء سے شروع ہوا، جو تا حال پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب امریکہ جنگ رکوانے کی کوشش کرتا ہے تو اسرائیل جنگ بندی پر آمادہ نظر نہیں آتا، اور عہد و پیمان کی پابندی نہیں کرتا اور جنگ بندی پر اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کرتا۔ گویا وہ اس بات پر راضی نہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے باشندے سکون و عافیت کی سانس لیں اور امن واطمینان کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

یہ وہ احساسات ہیں جو سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارم، متعدد تجزیوں اور دیگر معلوماتی وسائل کے مطالعے سے سامنے آتے ہیں، اور یہی حقیقت ہے، تاہم موجودہ حالات کے بعض تجزیہ نگاروں کے نزدیک صورتِ حال کا خلاصہ یہ ہے کہ باطل طاقتیں، خواہ وہ امریکہ ہو یا اسرائیل، مکمل جنگ بندی نہیں چاہتی ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک جنگ ہی ان کے مفادات، اثر و رسوخ اور عالمی بالادستی کو برقرار رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔

بہت سے تجزیہ نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکہ کی اقتصادی ترقی کا تمام تر انحصار اسلحہ سازی اور اسلحوں کی تجارت سے وابستہ ہے، اس لیے کہ اس کی معیشت کا بڑی حد تک انحصار اسلحہ سازی پر ہے۔ اسی بنا پر، ان کے خیال میں، امریکہ نہ چاہتے ہوئے بھی جنگوں میں ملوث ہو جاتا ہے، بلکہ بلا وجہ جواز بھی ان میں داخل ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ امریکہ کی بڑی اسلحہ ساز کمپنیاں جنگوں کے ذریعے غیر معمولی منافع اور بے پناہ سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے جنگیں ان کی معاشی زندگی کا ایک اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔

اسی بنا پر ماہر تجزیہ نگار لکھتے ہیں کہ اگر جنگیں نہ ہوں تو امریکہ اپنی موجودہ عالمی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکے گا، بلکہ اس کی طاقت، اثر و رسوخ اور سپر پاور ہونے کا دعویٰ خاک میں مل جائے گا۔ اسی طرح بعض اہل قلم نے اسے ''احترابی''، یعنی جنگ پسند کا نام دیا ہے۔

امریکہ کا دنیا کی حکومتوں اور مختلف ممالک پر غلبہ و اقتدار اور اثر و رسوخ کا سلسلہ نہایت طویل اور قدیم ہے، امریکہ اکثر پڑوسی ممالک کے درمیان پیدا ہونے والے داخلی اختلافات اور باہمی کشیدگی سے اپنے مفادات حاصل کرتا ہے۔ پھر انہی تنازعات کے خاتمے کے لیے ثالث اور منصف بننے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی ایک فریق کی حمایت کرتا ہے اور کبھی دوسرے کی، اور جنگوں سے ہونے والے جانی و مالی نقصانات پر مگر مچھ کے آنسو بھی بہاتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے قومی مفادات اور سیاسی مصالح کو ہمیشہ مقدم رکھتا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکہ نکولو میکیاویلی (Machiavelli) کے نظریہ پر مکمل یقین رکھتا ہے، جس کے مطابق مقصد کے حصول کے لیے ہر وہ ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے جو اسے کامیابی تک پہنچا دے۔

میکیاویلی ایک اطالوی مفکر اور قلم کار تھا۔ اس کی پیدائش ۱۴۶۹ء میں فلورنس (Florence) میں ہوئی اور ۱۵۲۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ اپنی معروف کتاب ''دی پرنس'' (The Prince) کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں حکومت، سیاست، اقتدار اور سلطنت کے استحکام و تحفظ کے مختلف اصول بیان کیے گئے ہیں، اور اسی کی نسبت سے ''میکیاویلی نظریہ'' معروف ہوا۔

یہ ایک ایسا سیاسی رجحان ہے جو سیاست کو اخلاقی اقدار پر غالب کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اگر انسان کے سامنے کوئی مقصد، ہدف یا ٹارگٹ ہو تو اس کے حصول کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔ خواہ اس کی قیمت بے گناہ انسانوں کی جانوں کی صورت میں ادا کرنی پڑے، گھروں کو منہدم کرنا پڑے یا کھیتیوں اور زراعتی زمینوں کو تباہ کرنا پڑے۔ اس نظریہ میں اخلاقی اقدار اور انسانی پہلوؤں کی کوئی خاص اہمیت نہیں سمجھی جاتی، بلکہ یہ ایک ایسا رخ ہے جسے انسانیت کے منافی قرار دیا

جاتا ہے۔ امریکہ اور اس کے پروردہ اسرائیل نے اسی انسانیت مخالف طرزِ فکر کو اپنا رکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ نہ کسی رشتے کا خیال کرتے ہیں اور نہ کسی عہد و پیمان کا وہ لحاظ کرتے ہیں بلکہ وہ پوری بے شرمی کے ساتھ معصوم اور بے گناہ مردوں، عورتوں، بچوں کا خون چوستے ہیں۔

اسرائیل اور اس کی وحشیانہ فطرت

یہود کو عہد و پیمان کی خلاف ورزی کے حوالے سے سب سے مشہور قوم قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی خیانت، دھوکے اور غداری کی داستانیں عہدِ نبوت سے لے کر آج تک بیان کی جاتی رہی ہیں۔ بنو قریظہ سے متعلق پیش آنے والا واقعہ بھی یہودیوں کی غداری اور خیانت کی تاریخ کا جلی عنوان ہے، اور یہ سلسلہ قائم رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس زمین اور اس پر رہنے والوں کا وارث ہوجائے۔ اسی بدترین خصلت اور عادت کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی کیا گیا ہے۔

أَوَ كُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْداً نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ۔ [البقرہ: ۱۰۰]

(جب بھی وہ معاہدہ کرتے ہیں تو ان کی ایک جماعت اس کو توڑ دیتی ہے، بلکہ ان میں سے اکثر گنہگار ہیں)، جہاں تک اسرائیل کی غداری، دھوکے بازی اور عہد شکنی کا تعلق ہے، تو اسرائیل نے حماس کے ساتھ متعدد مرتبہ معاہدے کیے، حملوں سے گریز اور جانوں کے تحفظ کے وعدے کیے، لیکن بعد ازاں ان معاہدوں کی بار بار خلاف ورزی کی۔ پوری دنیا نے دیکھا کہ اسرائیل نے ان عہد و پیمان کو شب و روز پامال کیا، بلکہ بے خوفی سے پیروں تلے کچلتا رہا، اور انسانیت کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا، اس کی وجہ سے انسانیت شکوہ کناں ہے اور لوگ آہ و بکا کر رہے ہیں، لیکن کوئی فریادرس نہیں۔

اسرائیل کے معاہدات میں موجودہ تاریخ کا سب سے نمایاں معاہدہ اوسلو معاہدہ ہے، جو اسرائیل اور فلسطین کی تنظیمِ آزادی (PLO) کے درمیان اور ۲۳ رستمبر ۱۹۹۳ء کو امریکہ کے شہر واشنگٹن میں طے پایا، اگرچہ اسے ناروے کے دارالحکومت اوسلو کی نسبت سے "اوسلو معاہدہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے مذاکرات وہیں مکمل ہوئے تھے۔ تاہم اسرائیلی قبضے نے اس معاہدہ کو بھی برقرار نہ رکھا اور اسے عملاً بے اثر بنا دیا، غزہ کے میڈیا آفس نے اسرائیل کی جانب سے متعدد معاہدوں کی خلاف ورزیوں کو ریکارڈ کیا تو ان کی تعداد تین ہزار تین سو اڑتیس (۳۳۳۸) نکلی، جو غزہ کی پٹی میں گزشتہ چند برسوں میں پیش آئے، اس اعداد و شمار سے سمجھ میں آتا ہے کہ اسرائیل صرف جنگ، تصادم اور قتل و غارت کی زبان سمجھتا ہے، اس لیے اس سے عہد و پیمان کی پاسداری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے نزدیک، میکیاویلی کے نظریات اس کی سیاسی فکر میں اس حد تک رچ بس گئے ہیں کہ وہ بین الاقوامی قوانین اور عالمی دستوروں کو مسلسل نظر انداز کرتا اور انہیں بے پروائی کے ساتھ پامال کرتا رہتا ہے۔

مغرب کا آسمانی کتابوں سے تعلق کس حد تک ہے؟

اگر اہلِ مغرب کی نسبت آسمانی کتابوں کی طرف کی جائے، یعنی ان کتابوں کی طرف جو ان کے انبیائے کرام پر نازل ہوئیں، اور وہ خود بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کتابوں کی تلاوت کرنے والے، ان کے علوم و معارف کے محافظ اور ان کے پیغام کے ناشر ہیں، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی آسمانی کتاب میں دھوکا، فریب، لوگوں کو نقصان پہنچانا، معصوموں کو قتل کرنا، یا کسی بے گناہ کا خون بہانا جائز قرار دیا گیا ہے؟ کیا کسی آسمانی شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ کسی قوم کو اس کے گھروں سے بے دخل کر دیا جائے، اس کی جائیدادوں پر قبضہ کرلیا جائے، یا اس کی سرزمین کو طاقت کے زور پر اس سے چھین لیا جائے؟

ہرگز نہیں! ان افعال کے جواز کو تو انسانی عقل بھی قبول نہیں کرتی، چہ جائیکہ وہ آسمانی کتابیں، جو روئے زمین پر عدل، انصاف اور قسط کے قیام کے لیے نازل کی گئی ہیں۔ لہٰذا اگر کسی کے اعمال ان تعلیمات سے متصادم ہوں، تو یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان تعلیمات کا حقیقی پیروکار کس بنیاد پر قرار دیتا ہے؟

یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ہفتے کے دو دن، یعنی سنیچر اور اتوار، مذہبی اور اجتماعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ایام میں لوگ عبادت گاہوں میں جمع ہوتے ہیں، اپنے مذہبی پیشواؤں کے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان کے احکام کی پابندی کا عہد کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنی عبادت گاہوں اور مذہبی مراکز سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی اولین ترجیح یہ ہوتی ہے کہ ان کی سیادت، قیادت، حکومت یا مفادات کے راستے میں جو چیز بھی رکاوٹ سمجھی جائے، اس کا کسی نہ کسی طرح ازالہ کیا جائے۔ اس تناظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بے خوفی سے اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان سے بھی روگردانی کر لیتے ہیں اور اپنے مذہبی اصولوں سے بھی انحراف کرتے ہیں۔

اسی بنا پر یہ کہنا حقیقت حال کے عین مطابق ہے کہ ایسے طرزِ عمل میں نہ دین کا حقیقی التزام و

اہتمام باقی رہتا ہے، نہ اخلاقی اقدار، نہ عہد و پیمان کی پاسداری، بلکہ مفادات، مصالح اور خواہشات کو اصل معیار بنالیا جاتا ہے۔ پھر انہی مفادات کی بنیاد پر ایسے کاموں کے لئے بھی جواز تلاش کیا جاتا ہے جنھیں نہ اخلاق پسند کرتے ہیں اور نہ انسانیت پسند کرتی ہے، قتل وخونریزی، قید وبند، بے گناہوں کو اذیت دینا اور کمزور ومعذور افراد کو مختلف قسم کی سختیوں میں مبتلا کرنا بھی اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ذہنیت کی فکری بنیاد اس نظریہ سے ملتی ہے جسے میکیاویلی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ ''مقصد کے حصول کے لیے ہر وسیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔'' ان کے نزدیک جب یہی اصول غالب آجائے تو پھر اخلاقی حدود اور دینی اقدار پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور مفاد کو ہر چیز پر ترجیح دی جانے لگتی ہے۔

دین اسلام کا مزاج

یقیناً اسلام ایک ایسا دین ہے جو پوری انسانیت کے لیے رحمت، عدل اور خیر کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اس کی تعلیمات سراپا انسانیت، انصاف اور اخلاق عالیہ پر مبنی ہیں۔ اسلام انسان کو اس کی خواہشاتِ نفس اور ذاتی ارادوں کا بے لگام تابع نہیں بناتا، بلکہ اس کے لیے حدود وقیود متعین کرتا ہے تاکہ وہ ان سے تجاوز نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ احکام کی پامالی کا مرتکب نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں متعدد غزوات اور معرکوں میں شرکت فرمائی، لیکن آپ ﷺ نے کبھی ظلم، زیادتی یا بلاجواز جارحیت کو اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ جنگ جیسے نازک موقع پر بھی عدل، رحمت اور اخلاق کے اعلیٰ ترین اصولوں کو قائم رکھا۔ صحابۂ کرامؓ کو بھی یہی تعلیم دی گئی کہ وہ صرف ان لوگوں سے قتال کریں جو ان کے خلاف ہتھیار اٹھائیں، انہیں قتل کرنے اور اسلام کو مٹانے کے درپے ہوں، اور کسی بے گناہ یا غیر مقاتل کو نشانہ نہ بنائیں۔

غزوۂ اُحد میں مشرکین نے مسلمانوں کے مقتولین کے ساتھ نہایت سنگ دلانہ اور وحشیانہ برتاؤ کیا۔ بعض شہداء کے ناک اور کان کاٹے گئے، ان کے جسموں کی بے حرمتی کی گئی، اور سید الشہداء حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے ان کا جگر نکال لیا گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ ہندہ نے اسے چبانے کی کوشش بھی کی۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ اس بات سے منع فرمایا کہ وہ دشمن کے مقتولین کے جسموں کی بے حرمتی کریں یا ان کے اعضاء کاٹ کر انہیں مسخ کریں۔ اس سے اسلام کی وہ عظیم اخلاقی تعلیم سامنے آتی ہے کہ جنگ کے میدان میں بھی انسانی وقار اور اخلاقی حدود کو پامال نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کی جنگی اخلاقیات عہد نبوی ہی میں پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آگئیں۔ اسلام نے قتال کو صرف ناگزیر حالات تک محدود رکھا اور اس کے لیے بھی واضح ضوابط مقرر کیے، تاکہ انسانی جان، عزت اور بنیادی حقوق حتی الامکان محفوظ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو کبھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ خواہش نفس یا ذاتی مفاد کی بنیاد پر جو چاہیں کرتے پھریں، بلکہ انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام، شریعت کے اصولوں اور ان انسانی اقدار کا لحاظ رکھیں جو عدل، رحمت، اخلاق اور انصاف پر قائم ہیں۔

لہٰذا دہشت گردی، بے گناہوں کو خوف زدہ کرنا، انسانی اقدار کو پامال کرنا اور ظلم وزیادتی کا ارتکاب اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے۔ جو شخص بھی ایسے قبیح افعال کا ارتکاب کرتا ہے، وہ عقلِ سلیم، اخلاقی اصولوں اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں قابل مواخذہ سمجھا جاتا ہے۔

☆☆☆

بقیہ: عہد نبویؐ کی جنگیں اور ان کے وسیع اثرات

...کیا ظلم وزیادتی کا استیصال ہوگیا؟ امن و امان کا راج قائم ہوگیا؟ عزتیں اور عصمتیں محفوظ ہو گئیں؟ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کا سامان ہوگیا؟ ہر ایک کو اس کے حقوق ملنے لگے؟ کیا انسانیت کا قتل وخون بند ہوگیا؟ آخر ان جنگوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس کا جواب سوائے اس کے کیا دیا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف اپنے غیظ وغضب کی آگ بجھانے، اپنی نفسانیت اور خودغرضی کی ہوس پوری کرنے اور دوسروں کی زمین اور مال و دولت پر ناجائز قبضہ کرنے کے سوا آخر کیا مقصد تھا؟

جبکہ رحمت عالم ﷺ کی سیرت اور اسلامی تاریخ کے صفحات پر بے شمار ایسے نادر و نایاب واقعات مل جائیں گے جن کا آج مہذب دنیا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ آج اپنے آپ کو تہذیب وتمدن کا علمبردار کہلانے والے، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی تعلیمات پر بے جا اعتراض کرنے والے اور الزامات لگانے والے اگر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں اور تعصب و عداوت کی عینک اتار کر سیرتِ نبوی اور اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو حقیقت خود بخود روشن ہوجائے گی۔

☆☆☆

ذرائع ابلاغ

میڈیا کے میدان میں پانچ لازمی اقدامات

مولانا منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

اکیسویں صدی کو میڈیا، معلومات اور بیانیے (Narrative) کی صدی کہا جاتا ہے۔ آج قوموں کی طاقت کا معیار صرف ان کی معیشت، سیاست یا عسکری قوت ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بات کس مؤثر انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں، اپنے بارے میں رائے عامہ کو کس حد تک متاثر کرتی ہیں اور اپنے افکار و اقدار کی ترجمانی کتنی مؤثر طریقے سے کرتی ہیں۔

موجودہ دور میں میڈیا محض اطلاعات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ اجتماعی شعور کی تشکیل، ترجیحات کی تعیین اور فکری سمت متعین کرنے کا سب سے طاقتور وسیلہ بن چکا ہے۔ اس لیے جس قوم کے پاس مضبوط بیانیہ اور مؤثر ابلاغی قوت ہو، وہی فکری قیادت بھی حاصل کرتی ہے۔

یہ صورت حال ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج بھی ہے اور ایک موقع بھی۔ ایک طرف ان کے بارے میں مختلف تصورات اور بیانیے تشکیل دیے جاتے ہیں، تو دوسری طرف ڈیجیٹل میڈیا نے یہ سہولت فراہم کر دی ہے کہ محدود وسائل کے باوجود ہر فرد اور ادارہ اپنی آواز وسیع پیمانے پر پہنچا سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے صرف ذرائع تک رسائی کافی نہیں، بلکہ واضح حکمتِ عملی، فکری بصیرت، اخلاقی رہنمائی اور پیشہ ورانہ مہارت بھی ضروری ہے۔

اس تناظر میں میڈیا کے میدان میں کرنے کے چند اہم اور ضروری کام ہیں، جن کی تکمیل کے لئے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے، یہ پانچ کام اس طرح ہیں:

میڈیا بیداری:

آج میڈیا صرف خبریں نہیں دیتا بلکہ رائے عامہ تشکیل دیتا، ذہن بناتا اور معاشرتی رجحانات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے میڈیا بیداری کا مطلب صرف سوشل میڈیا استعمال کرنا یا خبریں پڑھنا نہیں، بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ خبر کس طرح تیار ہوتی ہے، کس زاویے سے پیش کی جاتی ہے، کن حقائق کو نمایاں اور کن کو نظر انداز کیا جاتا ہے، اور کس طرح ایک مخصوص بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے۔

اسلام نے صدیوں پہلے خبر کی تحقیق کا جو اصول پیش کیا، وہ آج کی اصطلاح میں Fact Checking اور Media Verification کہلاتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ہر سنی سنائی بات کو آگے پھیلانے سے منع فرمایا۔ یہ تعلیمات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف خبر وصول کرنا نہیں بلکہ اس کی صحت، ماخذ اور نتائج کا جائزہ لینا بھی ہے۔

ڈیجیٹل دور میں افواہیں، جھوٹی خبریں اور گمراہ کن معلومات لمحوں میں لاکھوں افراد تک پہنچ جاتی ہیں۔ ایسے ماحول میں میڈیا بیداری ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے تاکہ وہ فیک نیوز، جذباتی پروپیگنڈے اور گمراہ کن بیانیوں کا شکار ہونے کے بجائے تنقیدی شعور کے ساتھ حقائق کا تجزیہ کر سکے۔ یہی شعور ایک عام صارف کو ذمہ دار اور باشعور ابلاغ کار میں تبدیل کرتا ہے۔

مثبت اور ذمہ دارانہ میڈیا استعمال:

میڈیا کو سمجھنے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کا درست اور مثبت استعمال ہے۔ اسلام میں کسی بھی ذریعہ کی قدر اس کے مقصد اور نتائج سے متعین ہوتی ہے۔ اسی لیے میڈیا بذاتِ خود نہ اچھا ہے نہ برا؛ اس کی حیثیت اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر یہی ذریعہ جھوٹ، نفرت، کردار کشی اور فحاشی کے فروغ کا وسیلہ بن جائے تو معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، لیکن اگر اسے علم، دعوت، اخلاق، انصاف اور انسانی خدمت کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ اصلاحِ معاشرہ کا مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔

آج میڈیا صرف تفریح کا وسیلہ نہیں بلکہ علم، تحقیق اور دعوت کا بھی سب سے وسیع میدان ہے۔ دنیا کی بڑی جامعات، تحقیقی جرائد، علمی کورسز اور جدید علوم چند لمحوں میں ہر طالب علم کی دسترس میں آ سکتے ہیں۔ اگر مسلم نوجوان اپنے وقت کا ایک حصہ سوشل میڈیا کی بے مقصد مصروفیات کے بجائے علمی و فکری ترقی پر صرف کریں تو ان کی انفرادی اور اجتماعی صلاحیتوں میں نمایاں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں دعوتِ اسلام، اخلاقی اصلاح اور سماجی خدمت کے لیے بھی میڈیا غیر معمولی امکانات رکھتا ہے۔ مختصر ویڈیوز، مضامین، پوڈکاسٹ اور دیگر ڈیجیٹل ذرائع کے ذریعے تعلیم، کردار سازی، سماجی ہم آہنگی، خدمتِ خلق اور دینی اقدار کو وسیع پیمانے پر فروغ دیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ تمام سرگرمیاں سچائی، دیانت،

انصاف، شائستگی اور ذمہ داری کے اصولوں کے مطابق ہونی چاہئیں، کیونکہ اسلامی صحافت اور ابلاغ کی بنیاد انہی اخلاقی اقدار پر قائم ہے۔

یہاں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ موجودہ دور میں سب سے بڑی مسابقت انسان کی توجہ حاصل کرنے کی ہے۔ اگرچہ سنسنی خیزی اور اشتعال انگیز مواد وقتی شہرت حاصل کر سکتا ہے، لیکن دیرپا اثر صرف اسی مواد کا ہوتا ہے جو تحقیق، اخلاق اور مثبت مقاصد پر مبنی ہو، اس لیے مسلمانوں کو وائرل ہونے کے بجائے مؤثر اور تعمیری ہونے کو اپنی ترجیح بنانا چاہیے۔

اس طرح میڈیا بیداری اور ذمہ دارانہ استعمال وہ بنیادی ستون ہیں جن پر ایک مضبوط، باوقار اور مؤثر میڈیا حکمتِ عملی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ انہی کے ذریعے مسلمان نہ صرف خود گمراہ کن اطلاعات سے محفوظ رہ سکتے ہیں بلکہ معاشرے میں علم، اعتدال اور خیر کے فروغ میں بھی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

میڈیا میں مؤثر نمائندگی اور اثر اندازی:

میڈیا کے میدان میں صرف صارف (Consumer) بن کر رہ جانا کسی بھی باشعور معاشرے کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ ضروری ہے کہ وہ خبر، تجزیہ اور رائے سازی کے عمل میں بھی مؤثر کردار ادا کرے۔ آج جو طبقات میڈیا میں مؤثر نمائندگی رکھتے ہیں، وہی عوامی رائے، قومی مباحث اور پالیسی سازی پر بھی زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ میڈیا میں اپنی مثبت، متوازن اور باوقار نمائندگی کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں۔ اس مقصد کے لیے صرف میڈیا پر تنقید کافی نہیں، بلکہ صحافت، ابلاغ عامہ، ڈاکومنٹریز، ڈیجیٹل میڈیا، فوٹو جرنلزم، تحقیق، ڈیٹا جرنلزم اور میڈیا مینجمنٹ جیسے شعبوں میں نوجوانوں کی پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام ضروری ہے۔ جب تک مختلف قومی اور علاقائی میڈیا اداروں میں اہل، باصلاحیت اور باکردار مسلم صحافی، اینکرز، تجزیہ نگار، مدیران اور میڈیا ماہرین کی مؤثر موجودگی نہیں ہوگی، اس وقت تک مسلم سماج کا نقطۂ نظر مطلوبہ انداز میں سامنے نہیں آ سکے گا۔

یہ نمائندگی محض کسی مخصوص طبقے کے دفاع کے لیے نہیں، بلکہ سچائی، انصاف، اعتدال اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ہونی چاہیے۔ ایک ذمہ دار صحافی اپنے مذہبی یا سماجی تشخص سے پہلے حقائق کی دیانت دارانہ ترجمانی کا امین ہوتا ہے۔ یہی اسلامی تعلیمات کا تقاضا بھی ہے اور صحافت کی بنیادی اخلاقیات بھی۔

متبادل میڈیا اداروں کی تعمیر:

موجودہ دور میں کوئی بھی قوم محض دوسروں کے میڈیا پر انحصار کر کے دنیا میں مؤثر کردار نہیں ادا کر سکتا، اپنے افکار، اقدار اور مسائل کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کے لئے اپنے میڈیا ادارے، تربیتی مراکز اور ابلاغی پلیٹ فارم بھی قائم کرنے ہوں گے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ڈیجیٹل انقلاب نے اس کام کو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان اور کم خرچ والا بنا دیا ہے۔ آج ایک معیاری ویب پورٹل، یوٹیوب چینل، ڈیجیٹل میگزین یا تحقیقی پلیٹ فارم محدود وسائل کے ساتھ بھی قائم کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے پیچھے واضح مقصد، مسلسل محنت اور پیشہ ورانہ معیار موجود ہو۔

واضح رہے کہ میڈیا ادارہ محض ایک چینل یا ویب سائٹ کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا منظم نظام ہے جس میں تحقیق، ادارتی منصوبہ بندی، تربیت یافتہ افرادی قوت، مالی استحکام اور طویل المدت حکمتِ عملی بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں صرف بڑے منصوبوں کا انتظار کرنا بھی مناسب نہیں۔ چھوٹے مگر مسلسل اقدامات ہی بڑے اداروں کی بنیاد بنتے ہیں۔ اگر مختلف شہروں کالجوں، جامعات اور مدارس میں میڈیا لٹریسی کے مراکز، تربیتی ورکشاپس، کمیونٹی میڈیا گروپس اور نوجوان صحافیوں کے نیٹ ورک قائم کیے جائیں تو یہی مستقبل میں مضبوط میڈیا اداروں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

کسی بھی تعمیری تحریک کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ نظریے کے ساتھ ساتھ ادارے بھی تشکیل دے، کیونکہ افراد بدلتے رہتے ہیں مگر ادارے فکر اور خدمت کے سفر کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں

معیاری میڈیا مواد کی تخلیق:

میڈیا پلیٹ فارم کے قیام کے بعد سب سے ضروری عمل یہ ہے کہ ان پلیٹ فارمز کے ذریعے کس معیار کا مواد پیش کیا جائے۔ اگر مواد تحقیق، دیانت، فکری گہرائی اور اعلیٰ پیشہ ورانہ معیار سے محروم ہو تو جدید ترین ذرائع بھی دیرپا اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس، اگر ایک مختصر تحریر، ایک مؤثر ویڈیو یا ایک تحقیقی رپورٹ سچائی، علم اور حکمت پر مبنی ہو تو وہ لاکھوں ذہنوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت ایسے معیاری میڈیا مواد کی ضرورت ہے جو صرف ردِعمل (Reaction) تک محدود نہ ہو بلکہ مثبت بیانیہ (Positive Narrative) تشکیل دے۔ ایسا مواد جو اسلام کی حقیقی تعلیمات، مسلمانوں کی علمی و تہذیبی خدمات، سماجی مسائل کے عملی حل، قومی یکجہتی، آئینی اقدار اور انسانی ہمدردی کو مدلل، متوازن اور دل

نشیں انداز میں پیش کرے۔ وقتی جذبات، سنسنی خیزی اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو چند لمحوں کی توجہ تو حاصل کرسکتی ہے، لیکن قوموں کی فکری تعمیر ہمیشہ سنجیدہ، تحقیقی اور باوقار ابلاغ سے ہوتی ہے۔

آج مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور سوشل میڈیا نے ہر فرد کو صحافی بنا دیا ہے۔ اس لیے ہماری ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ ملت کا ہر نوجوان صحافت کی بنیادوں سے واقف ہو، اور اپنی صلاحیت کے مطابق میڈیا کا استعمال کرے، ہمارے نوجوان ایسا صحافتی مواد تخلیق کریں جو اعتماد پیدا کرے، دلوں کو جوڑے، غلط فہمیوں کو دور کرے اور معاشرے میں خیر، انصاف اور اعتدال کے فروغ کا ذریعہ بنے۔

ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے کہ میڈیا کے میدان میں مؤثر موجودگی کسی ایک دن، ایک مہم یا ایک ادارے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے مسلسل محنت، فکری بصیرت، ادارہ سازی، تربیت یافتہ افرادی قوت اور طویل المدت منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے۔ جو قومیں آج عالمی میڈیا پر اثر انداز ہیں، انہوں نے یہ مقام برسوں کی منظم کوششوں، سرمایہ کاری اور انسانی وسائل کی تیاری کے بعد حاصل کیا ہے۔ تاہم طویل منصوبوں کی ضرورت کا مطلب یہ نہیں کہ ہم وسائل کے مکمل ہونے یا مثالی حالات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ہر بڑی تحریک کی ابتدا ایک چھوٹے مگر مخلص قدم سے ہوتی ہے۔

آج ضرورت شکایتوں میں اضافہ کرنے کی نہیں، بلکہ صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کی ہے؛ دوسروں کے بیانیے کا صرف جواب دینے کی نہیں، بلکہ اپنا مثبت اور تعمیری بیانیہ پیش کرنے کی ہے؛ محض میڈیا کے صارف بننے کی نہیں، بلکہ اس کے ذمہ دار معمار بننے کی ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان میڈیا بیداری، اخلاقی ابلاغ، پیشہ ورانہ مہارت، ادارہ سازی اور معیاری مواد کی تخلیق کو اپنی اجتماعی ترجیحات میں شامل کرلیں تو وہ نہ صرف اپنی بہتر نمائندگی کرسکیں گے بلکہ ملک و معاشرے کی فکری، اخلاقی اور سماجی تعمیر میں بھی مؤثر کردار ادا کریں گے۔

خوب یاد رکھنا چاہیے کہ منزل ہمیشہ دور نظر آتی ہے، مگر سفر کا آغاز ہمیشہ پہلا قدم اٹھانے سے ہوتا ہے۔ آج کا ایک چھوٹا، منظم اور مخلص عملی اقدام کل کی ایک مضبوط میڈیا تحریک کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں بڑے خواب ضرور دیکھنے چاہئے، طویل المدت منصوبے بھی ضرور بنانے چاہییں، لیکن ان خوابوں کی تعبیر کا آغاز آج، اسی لمحے، زمینی سطح پر عملی کام سے ہونا چاہیے۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے اور یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی۔

☆☆☆

بدگمانی کے سنگین نتائج

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

انسانی معاشرہ کے لیے جہاں اور بہت سی باتیں مضر ہیں، وہیں بدگمانی یا سوءظن کے نتائج بھی بہت سنگین اور خطرناک ہیں، یہ معاشرہ کا پیچیدہ مرض ہے جس کی دوا کسی طبیب کے پاس نہیں، جس ماحول میں یہ بیماری پھیل جائے وہ انتہائی بدنصیب اور زندگی کے لطف ومسرت سے محروم ماحول ہے، یہی وہ گھن ہے جو رفتہ رفتہ سوسائٹی کی بنیاد کو کھوکھلا کرکے رکھ دیتا ہے اور ہوا کا ایک خفیف جھونکا بھی اس کے وجود کو ختم کردینے کے لیے کافی ہوتا ہے، اجتماعی زندگی کا شیرازہ منتشر کرنے میں بدگمانی کا کردار ایک مسلمہ حقیقت ہے، اسی کی بدولت کتنے ملے ہوئے دل متفرق اور کتنے متحد اجتماعی معاملات، انتشار اور شکست وریخت کے انجام سے دوچار ہوکر رہے۔

اگر ہم اپنی اجتماعی زندگی کا تجزیہ کریں تو بدگمانی کی کارفرمائیاں ہم کو قدم قدم پر نظر آئیں گی، دو بھائیوں کا اختلاف ہو یا دو جماعتوں کا، ہر اختلاف کی تہہ میں بدگمانی کا کردار سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دے گا، شوہر کو بیوی سے یا بیوی کو شوہر سے بدگمانی کا انجام قتل یا کم از کم جدائی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، بعض مثالیں تو ایسی ہیں کہ شوہر کو اپنی بیوی سے بدگمانی ہوگئی جو محض غلط فہمی پر مبنی تھی، مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ بدگمانی اس کے دل میں اس قدر راسخ ہوگئی کہ شوہر نے اس اضطراب اور دردسری سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی کو جس پر کسی زمانے میں سب سے زیادہ اس کو اعتماد تھا، قتل کردیا، اور نہ صرف یہ کہ بیوی کو قتل کرکے اس کو اطمینان ہوا؛ بلکہ یکے بعد دیگرے اس نے اپنے ۸/بچوں کو قتل کرکے اس دردسری سے نجات حاصل کی، بعد میں معلوم ہوا کہ جس بنا پر اس نے اتنے عظیم گناہ کا ارتکاب کیا وہ محض غلط فہمی تھی، حقیقت سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ ☆☆

تذکیر و ارشاد

استغفار کے ثمرات اور مسنون اذکار

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ، بھٹکل)

استغفار کے بے شمار فوائد علمائے کرام نے بیان فرمائے ہیں۔ سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ یہ گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾ ”جو شخص کوئی برائی کر بیٹھے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے، وہ اللہ کو نہایت بخشنے والا، بڑا مہربان پائے گا۔“

استغفار اللہ کے عذاب کو بھی ٹال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ ”اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے جب کہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔“

استغفار غموں کو دور کرنے، تنگیوں سے نجات دلانے اور رزق میں وسعت پیدا کرنے کا بھی عظیم ذریعہ ہے۔ یہ بارش کی فراوانی، مال و اولاد میں برکت، باغات کی شادابی اور نہروں کے جاری ہونے کا بھی سبب بنتا ہے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا﴾ [نوح: ۱۰-۱۲] ”اپنے رب سے بخشش مانگو، بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغات پیدا کرے گا اور نہریں جاری کر دے گا۔“

اور حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: ﴿وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ﴾ [هود: ۵۲] ”اے میری قوم! اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اسی کی طرف توبہ کرو، وہ تم پر خوب بارش برسائے گا اور تمھاری قوت میں مزید اضافہ فرمائے گا۔“

استغفار صرف گناہ گاروں ہی کی ضرورت نہیں، بلکہ نیک اور عبادت گزار لوگ بھی اس کے محتاج ہیں، کیوں کہ ہر عبادت میں کسی نہ کسی درجے کا نقص اور کوتاہی رہ جاتی ہے، اور استغفار اسی کمی کی تلافی کرتا ہے۔

اسی لیے شریعت نے عبادات کے بعد استغفار کو مشروع قرار دیا ہے۔ وضو سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا سکھائی گئی: ”اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ۔“ ”اے اللہ! مجھے بہت زیادہ توبہ کرنے والوں میں شامل فرما اور مجھے پاکیزگی اختیار کرنے والوں میں بنا۔“

نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ تین مرتبہ ”أستغفر الله“ پڑھا کرتے تھے۔

اللہ کے نیک بندوں کا حال یہ بتایا گیا کہ وہ راتیں اپنے رب کے حضور سجدہائے نیاز میں گزارتے ہیں، اور جب سحر کا وقت آتا ہے تو خشوع و انکسار کے ساتھ استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے ان سے جنت کی نعیم جاودانی کا وعدہ فرمایا ہے:﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ، آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ، كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ [الذاريات: ۱۵-۱۸] ”بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے...... وہ رات کا بہت تھوڑا حصہ سوتے تھے، اور سحر کے اوقات میں اپنے رب سے مغفرت مانگا کرتے تھے۔“

ہمیں اپنے لیے بھی کثرت سے استغفار کرنا ہے اسی طرح تمام اہل ایمان کے لیے بھی دعائے مغفرت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ یہی فرشتوں کا طریقہ، انبیائے کرام کی سنت اور صالحین کا شعار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے بارے میں فرمایا: ﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا﴾ [غافر: ۷] ”جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں، وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔“

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے:﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ [نوح: ۲۸] ”اے میرے رب! مجھے، میرے والدین کو، میرے گھر میں

ایمان کے ساتھ داخل ہونے والوں کو، اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کو بخش دے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ [إبراهيم: ۴۱] ''اے ہمارے رب! مجھے، میرے والدین کو اور تمام اہلِ ایمان کو اس دن بخش دینا جب حساب قائم ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی حضرت محمد ﷺ کو بھی حکم دیا: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ [محمد: ۱۰] ''اپنے گناہ کی بھی مغفرت مانگئے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی استغفار کیجیے۔''

صالح اہلِ ایمان کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ [الحشر: ۱۰] ''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ایمان میں ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔''

اس لیے اپنے استغفار میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو بھی شریک کرنا چاہیے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جو شخص تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے استغفار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کے بدلے اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔'' (طبرانی۔ بسند حسن)

اور سب سے بڑھ کر والدین کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ انبیائے کرام کی سنت اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے۔ قرآن کریم میں دعا سکھائی گئی ہے:

﴿وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [الإسراء: ۲۴] ''اور تم کہو کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت نازل فرما جیسا کہ انھوں نے بچپن میں میری تربیت کی۔''

والدین کے لیے دعا کرنے سے ان کو فائدہ پہنچتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں ایک شخص کا درجہ بلند کر دیا جاتا ہے، وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے: یہ مجھے کیسے حاصل ہوا؟ تو اسے بتایا جاتا ہے: یہ تمھارے بیٹے کی تمھارے لیے کی گئی دعائے مغفرت کا نتیجہ ہے۔''

استغفار کے لیے کسی وقت اور جگہ کی پابندی نہیں ہے بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ مشروع ہے، البتہ بعض اوقات اور بعض مواقع ایسے ہیں جن میں اس کی فضیلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ عبادات کی ادائیگی کے بعد استغفار کیا جائے، تاکہ عبادت میں جو کمی، کوتاہی یا نقص رہ گیا ہو، اس کا ازالہ ہو سکے۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر پانچوں فرض نمازوں کے بعد استغفار مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، کیوں کہ انسان غفلت، سہو یا عدمِ توجہ کے باعث اپنی نماز میں کسی نہ کسی درجے کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں پڑھنے کے لیے دعا سکھانے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے انھیں استغفار پر مشتمل دعا ہی سکھائی: قُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا، وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (متفق علیه) ''کہو: اے اللہ! میں نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا ہے، گناہوں کو صرف آپ ہی معاف کرنے والے ہیں، اپنے فضلِ خاص سے میرے گناہوں کو معاف فرما اور مجھ پر رحم فرما، یقیناً تو بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔''

سوچیے، کون کس کو اور کس موقع پر یہ دعا تلقین کر رہا ہے؟!

اسی طرح تہجد کے موقع پر بھی استغفار مشروع ہے۔ جیسا کہ اوپر اہلِ تقویٰ کے بارے میں بیان کیا گیا، اور ایک دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ﴾ [آل عمران: ۱۷] ''اور وہ سحر کے اوقات میں استغفار کرنے والے ہیں۔''

اسی طرح میدانِ عرفات سے واپسی اور وقوفِ عرفہ کی تکمیل کے بعد بھی استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [البقرة: ۱۹۹] ''پھر وہاں سے واپس لوٹو جہاں سے دوسرے لوگ لوٹتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

اسی طرح مجلس کے اختتام پر بھی استغفار مشروع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمائی کہ جب کوئی شخص اپنی مجلس سے اٹھے تو یہ دعا پڑھے:

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ (ابو داؤد)

''اے اللہ! تو ہر عیب سے پاک ہے، تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں اور تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ مجلس خیر و

بھلائی کی تھی تو یہ دعا اس پر مہرِ قبولیت ثبت کر دیتی ہے، اور اگر اس میں کوئی لغزش یا کوتاہی ہوئی ہو تو یہ اس کا کفارہ بن جاتی ہے۔

اسی طرح عمر کے آخری حصے اور بڑھاپے میں بھی کثرتِ استغفار کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کی ظاہری زندگی اپنے اختتام کے قریب پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر سورۂ نصر نازل فرمائی:

﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ، وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ﴾

''جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے، اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے، بے شک وہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم ایک ہی مجلس میں رسول اللہ ﷺ کو سو مرتبہ یہ دعا پڑھتے ہوئے شمار کرتے تھے:

''اے میرے رب! مجھے بخش دے، میری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔'' (مسند احمد)

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اس شخص کے لیے خوش خبری ہے، جو اپنے نامۂ اعمال میں کثرت سے استغفار لکھا ہوا پائے۔''

استغفار کے متعدد الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ مختصر الفاظ یہ ہیں: ''أستغفر الله، أستغفر الله''، یعنی: میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طلب گار ہوں، یا اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے بخش دے۔ اسی طرح یہ الفاظ بھی پڑھے جا سکتے ہیں:

''أستغفر الله وأتوب إليه'' یا ''أستغفر الله الذي لا إله إلا هو الحي القيوم وأتوب إليه''، یا ''رب اغفر لي وتب عليَّ إنك أنت التواب الرحيم''، یا ''رب اغفر لي وتب عليَّ إنك أنت التواب الغفور''۔

البتہ استغفار کے تمام اذکار میں سب سے افضل اور جامع دعا ''سید الاستغفار'' ہے۔ حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سَيِّدُ الِاسْتِغْفَارِ أَنْ تَقُولَ: اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِي فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، قَالَ: وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوقِنًا بِهَا فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُمْسِيَ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وَهُوَ مُوقِنٌ بِهَا فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يُصْبِحَ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ (بخاری)

سید الاستغفار یہ ہے کہ بندہ یوں کہے:

''اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو نے مجھے پیدا فرمایا اور میں تیرا بندہ ہوں۔ جہاں تک میری استطاعت ہے، میں تیرے عہد اور تیرے وعدے پر قائم ہوں۔ میں اپنے کیے ہوئے اعمال کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اقرار کرتا ہوں، اور تیرے سامنے اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں، پس تو مجھے بخش دے، کیوں کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس دعا کو دن کے وقت پورے یقین کے ساتھ پڑھے اور شام ہونے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے، وہ اہلِ جنت میں سے ہوگا۔ اور جو اسے رات کے وقت یقین کے ساتھ پڑھے اور صبح ہونے سے پہلے وفات پا جائے، وہ بھی اہل جنت میں سے ہوگا۔''

گناہ کس سے نہیں ہوتا، انسان خطا کا پتلا ہے، ہر انسان سے خطا ہوتی ہے، البتہ خطا کاروں میں بہترین ان کو قرار دیا گیا ہے جو بار بار اللہ کی طرف رجوع کرتے اور توبہ کرتے رہتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمھیں دنیا سے اٹھا لیتا اور تمھاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا جو گناہ کرتے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے، اور اللہ انھیں بخش دیتا۔''

ہم لوگوں کو چاہیے، بالخصوص ملک وملت اور عالم اسلام کے جن ناگفتہ بہ حالات سے ہم گزر رہے ہیں ان میں خاص طور پر اللہ سے رجوع کریں، اپنے گناہوں اور اپنے قصوروں کو یاد کر کے اللہ سے معافی مانگیں، دلوں میں اخلاص پیدا کریں اور اپنی زبانوں کو کثرتِ استغفار کا عادی بنائیں، مگر اس طرح کہ دل بھی اس میں حاضر ہو، گناہ سے حقیقی توبہ کی جائے، اس پر ندامت ہو، اور اس کے بعد نیک اعمال اختیار کیے جائیں، تاکہ ہم دنیا وآخرت دونوں کی سعادت حاصل کر سکیں اور اپنے ربِّ کریم کی رضا کے مستحق بن جائیں۔ آمین!

نسخۂ کیمیا

قرآنی تمثیلات میں پنہاں اشارات

مولانا محمد اعظم ندوی (استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد)

قرآنِ مجید کا اسلوبِ بیان نہایت مؤثر، بلیغ اور دل نشیں ہے۔ انھی اسالیب میں ایک نمایاں اسلوب تمثیل (Allegory) کا بھی ہے۔ قرآن کسی مجرد حقیقت، اخلاقی کیفیت، ایمانی قدر یا انسانی رویّے کو ایک محسوس منظر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، تاکہ وہ لوگوں پر گہرا اثر ڈالے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

''یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، اور انہیں اہلِ علم ہی سمجھتے ہیں'' (العنکبوت: ۴۳)۔

قرآنی امثال محض ادبی آرائش نہیں، بلکہ تزکیہ وتربیت، استدلال اور حقیقت شناسی کا ایک مؤثر وسیلہ ہیں۔ ان میں ایمان وکفر، اخلاص و ریا، دنیا وآخرت، توحید وشرک، ظلم وانصاف اور قوت و ناتوانی سے متعلق حقائق ایسی تصویری زبان میں سامنے آتے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان مناظر کے درمیان محسوس کرتا ہے۔ کبھی ایک دانہ سات سودانوں میں بدلتا دکھائی دیتا ہے، کبھی گلزار ومرغزار باد وباراں اور آتشِ سوزاں کی نذر ہوجاتا ہے، کبھی اعمال سراب بن جاتے ہیں، کبھی دنیا چند روزہ شادابی کے بعد پژمردہ نظر آتی ہے، اور کبھی شرک کو مکڑی کے جال سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہم یہاں ایسی چند قرآنی امثال ذکر کرتے ہیں۔

اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے والوں کی مثال

اللہ تعالیٰ نے مخلصانہ انفاق کو ایک ایسے دانے سے تشبیہ دی ہے جس سے سات بالیاں نکلتی ہیں اور ہر بالی میں سودانے ہوتے ہیں:

''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے مزید بڑھا دیتا ہے۔'' (البقرہ: ۲۶۱)

یہ مثال محض اجرِ کثیر کو بیان نہیں کرتی، بلکہ اخلاص کے مزاج کو بھی واضح کرتی ہے۔ کسان دانہ زمین میں دفن کرتا ہے؛ بظاہر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، مگر اسی پوشیدگی سے اس کی افزائش کا سفر شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی رضا کے لیے دیا جانے والا مال کبھی ظاہری شہرت کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ منت پذیری، اذیت رسانی اور خودنمائی سے محفوظ رہے تو اللہ کے ہاں پھلتا پھولتا اجرِ عظیم میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر سرسبز باغ کی مثال سے سمجھایا گیا ہے:

''جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے اور دلوں کی آمادگی کے ساتھ مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال کسی بلندی پر واقع باغ کی سی ہے؛ اس پر موسلا دھار بارش ہو تو دوگنا پھل دے، اور اگر تیز بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار ہی کافی ہو جائے۔'' (البقرہ: ۲۶۵)

ریاکار کے عمل کی حقیقت

اس کے برخلاف ریا کاری کے ساتھ کیا جانے والا انفاق ایک چکنی چٹان پر پڑی ہوئی مٹی کی طرح ہے:

''اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت دے کر ضائع نہ کرو، اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی مثال ایک چکنی چٹان کی سی ہے جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اسے بالکل صاف چھوڑ دے؛ ایسے لوگ اپنی کمائی میں سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔'' (البقرہ: ۲۶۴)

ریا کاری بظاہر عمل کو خوش نما بناتی ہے، لیکن باطن میں اس کی بنیاد کھوکھلی ہوتی ہے۔ جیسے چٹان پر موجود مٹی دور سے زرخیز دکھائی دے، مگر بارش پڑتے ہی اس کی حقیقت ظاہر ہوجائے، اسی طرح ریاکار کا عمل دنیا میں قابلِ قدر معلوم ہوسکتا ہے، مگر آخرت میں اس کے پاس کوئی ثمر باقی نہیں رہتا۔

قرآن اسی نقصان کو ایک ایسے شخص کے باغ سے بھی تعبیر کرتا ہے جو بڑھاپے میں پہنچ چکا ہو، اس کی اولاد کمزور ہو، اور اس کی پوری امید اسی باغ سے وابستہ ہو، پھر اچانک آگ لیے ہوئے بگولا اسے جلا ڈالے:

''کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہوگی کہ اس کے پاس کھجور اور انگوروں کے باغ ہوں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس میں ہر طرح کے پھل ہوں، اور اس پر بڑھاپا آ جائے، جبکہ اس کے بچے بھی کمزور ہوں، پھر اس باغ کو آگ کا ایک بگولا آ

لگے اور وہ جل کر رہ جائے؟“(البقرہ:۲۶۶)

یہ مثال اس حسرت کو مجسم کرتی ہے جو قیامت کے دن اس شخص کو ہوگی جس نے عمر بھر بظاہر نیک اعمال کیے، مگر انہیں ریا، احسان جتانے، خود پسندی اور اذیت رسانی سے برباد کر دیا۔ جب اسے ان اعمال کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی، تب وہ انہیں راکھ کی طرح بکھرا ہوا پائے گا۔

سود خور کی عبرت ناک حالت

قرآن نے سود خوروں کی آخرت کا حال بھی نہایت بدترین مثال سے بیان کیا ہے:

”جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت میں اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر مخبوطُ الحواس بنا دیا ہو۔“(البقرہ:۲۷۵)

سود صرف ایک مالی معاملہ نہیں، بلکہ انسان کی اخلاقی اور معاشرتی حس کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔ وہ ضرورت مند کی مجبوری کو نفع کا ذریعہ، کمزور کی پریشانی کو سرمایہ، اور معاشرتی عدمِ توازن کو کاروباری موقع پرستی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی مناسبت سے قیامت میں اس کی کیفیت اضطراب، عدمِ توازن اور ذلت کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

ایمان کے بغیر اعمال کی بے ثباتی

قرآن ان اعمال کا انجام بھی بیان کرتا ہے جو بظاہر انسانی خدمت، خیر خواہی اور فلاحی سرگرمیوں پر مشتمل ہوں، مگر ان کی بنیاد ایمان اور توحید پر قائم نہ ہو۔ ایسے اعمال کو سراب سے تشبیہ دی گئی ہے:

”کافروں کے اعمال اس سراب کی مانند ہیں جو چٹیل میدان میں ہو؛ پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا، بلکہ اللہ کو اپنے سامنے پاتا ہے، پھر اللہ اس کا پورا حساب چکا دیتا ہے۔“(النور:۳)

سراب دور سے پانی معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ عمل جو اللہ کی معرفت، توحید اور آخرت کی جواب دہی سے خالی ہو، دنیا میں شہرت، عزت یا فائدہ دے سکتا ہے، لیکن آخرت میں نجات کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

ایک دوسری مثال میں ایسے اعمال کو راکھ کہا گیا ہے جسے تند و تیز ہوا اڑا لے جائے:

”جو لوگ اپنے پروردگار کا انکار کرتے ہیں، ان کے اعمال کی حالت ایسی راکھ کی طرح ہے جس کو تیز آندھی کے دن ہوا پوری قوت سے اڑا کر لے جائے۔“(ابراہیم:۱۸)

یہاں اصل نکتہ یہ ہے کہ عمل کی بقا اس کے ظاہری حجم سے نہیں، بلکہ اس کی ایمانی بنیاد سے وابستہ ہے۔ جس عمارت کی بنیاد ہی نہ ہو، وہ خواہ کتنی شاندار نظر آئے، پہلی آندھی میں گر جاتی ہے۔

اسی طرح کافروں کے انفاق کو ایک ایسی سرد یا جھلسا دینے والی ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے جو کھیتی کو تباہ کر دے:

”جو کچھ وہ دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہو، وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو پہنچے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو، اور اسے تباہ کر دے۔“(آل عمران:۱۱۷)

دنیا کی حقیقت: چند روزہ بہار

دنیا کی چمک دمک انسان کو سب سے زیادہ دھوکے میں ڈالتی ہے، اور اسی لیے وہ متاعِ غرور کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ قرآن نے اسے بارش سے اگنے والی سرسبز فصل کے مانند قرار دیا ہے، جو اچانک تباہ ہو کر ایسے غائب ہو جاتی ہے جیسے کبھی تھی ہی نہیں:

”بے شک دنیوی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے جس کو ہم نے آسمان سے اتارا، پھر اس سے زمین کے پودے گھنے ہو کر نکل آئے، جن میں سے انسان بھی کھاتے ہیں اور جانور بھی۔ یہاں تک کہ جب کھیتی اپنی بہار پر آ گئی، خوب سنور گئی، اور زمین والوں کو خیال ہوا کہ اب تو یہ ان کے قابو میں ہے، اچانک دن یا رات میں ہمارا حکم آ پہنچا، اور ہم نے اس کو ایسا کٹا ہوا ڈھیر بنا دیا کہ گویا کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔“(یونس:۲۴)

یہ مثال دنیا کی بے ثباتی کو نہایت مؤثر انداز میں آشکار کرتی ہے۔ انسان جب اسبابِ دنیا پر مکمل اعتماد کر لیتا ہے، اپنی کامیابیوں کو دائمی سمجھنے لگتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اب سب کچھ اس کے اختیار میں ہے، تبھی قدرتِ الٰہی کا ایک فیصلہ تمام ظاہری رونق کو مٹا دیتا ہے۔ اس لیے دنیا کی نعمتیں مقصودِ اصلی نہیں، بلکہ امتحان کا ذریعہ ہیں، اور ان کی حقیقی قدر اسی وقت ہے جب انہیں آخرت کی کامیابی کے لیے استعمال کیا جائے۔

توحید اور شرک کا نفسیاتی فرق

قرآن نے موحد اور مشرک کی داخلی کیفیت کو دو غلاموں کی مثال سے واضح کیا ہے: ایک غلام کئی جھگڑالو آقاؤں کی ملکیت ہو، اور دوسرا صرف ایک ہی شخص کا تابع ہو۔

”اللہ ایک شخص کی مثال بیان کرتا ہے جس میں کئی جھگڑالو شریک ہوں، اور دوسرا شخص جو مکمل طور پر ایک ہی مالک کا ہو؛ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟“(الزمر:۲۹)

مشرک کی زندگی کئی متضاد مرکزوں میں بٹ جاتی ہے۔ وہ کبھی لوگوں کو راضی کرنا چاہتا

ہے، کبھی خواہشات کی تسکین کا سامان کرتا ہے، کبھی مال و دولت میں طمانیت ڈھونڈتا ہے، اور کبھی کسی اور چیز میں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر منتشر، ارادہ کمزور اور شخصیت متزلزل رہتی ہے۔ اس کے برخلاف موحد کی سمت ایک ہوتی ہے، اس کا مقصود ایک اور اس کی بندگی کا مرکز بھی ایک ہوتا ہے۔ یہی وحدت اسے داخلی سکون، قوتِ ارادی اور اخلاقی استقامت عطا کرتی ہے۔

معبودانِ باطل کی بے بسی

قرآن نے باطل معبودوں کی بے بسی کو ایک گونگے، عاجز اور بوجھ بنے ہوئے غلام سے تشبیہ دی ہے:

''اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے: ان میں سے ایک گونگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور اپنے مالک پر بوجھ ہے؛ اسے جہاں بھی بھیجا جائے کوئی بھلائی نہیں لاتا۔ کیا وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو عدل کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر قائم ہے؟'' (النحل: ۷۶)

یہ تمثیل اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ جن ہستیوں یا قوتوں کو اللہ کے سوا معبود یا کارساز سمجھا جاتا ہے، وہ نہ اپنے لیے کسی نفع و نقصان کی مالک ہیں اور نہ دوسروں کے لیے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کامل قدرت، کامل حکمت اور کامل عدل کا مالک ہے، اور اسی کی بندگی انسان کو صحیح سمت عطا کرتی ہے۔

کلمۂ توحید: ایک تناور درخت

قرآن نے کلمۂ توحید کو ایک پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے:

''پاکیزہ کلمے کی مثال پاکیزہ درخت کی سی ہے، جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوں، جو اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہو۔'' (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

اس کے برعکس کفر و شرک کو ایک ایسی ناپاک جھاڑی سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ دی جائے:

''اور ناپاک کلمے کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو، اور اس کے لیے کوئی قرار نہ ہو۔'' (ابراہیم: ۲۶)

باطل نظریہ وقتی شور، طاقت اور نمود پیدا کر سکتا ہے، لیکن اس کے پاس حقیقی ثبات نہیں ہوتا، کیونکہ وہ فطرت، عقل اور وحی کی بنیاد سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف توحید کی جڑیں دل، عقل اور کائنات کی حقیقت میں پیوست ہوتی ہیں، اس لیے اس کے اثرات بھی دیرپا اور ثمر آور ہوتے ہیں۔

مکھی کی مثال اور شرک کی حقارت

قرآن نے شرک کی بے مائیگی کو ایک نہایت سادہ مگر فیصلہ کن مثال سے واضح کیا ہے:

''جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ سب اس کام کے لیے جمع ہو جائیں؛ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اسے واپس بھی نہیں لے سکتے۔ طالب بھی کمزور اور مطلوب بھی کمزور۔'' (الحج: ۷۳)

یہ مثال انسان کے خود ساختہ معبودوں کی انتہائی بے بسی کو نمایاں کرتی ہے۔ جو ہستیاں ایک معمولی سی مخلوق پیدا کرنے یا اس سے اپنی چیز واپس لینے کی قدرت نہیں رکھتیں، وہ انسان کی تقدیر سنوارنے یا اس کی مشکلات دور کرنے کی قدرت کیسے رکھ سکتی ہیں؟

مکڑی کا گھر: باطل سہاروں کی حقیقت

شرک، غیر اللہ پر اعتماد اور باطل قوتوں سے امید باندھنے کی مثال مکڑی کے گھر سے دی گئی ہے:

''جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا لیے، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے گھر بنایا، اور بے شک سب گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے، کاش وہ جانتے۔'' (العنکبوت: ۴۱)

مکڑی کا جالا دیکھنے میں نہایت منظم اور خوب صورت ہوتا ہے، مگر وہ نہ بارش سے بچا سکتا ہے، نہ ہوا سے، نہ کسی حملے سے۔ اسی طرح انسان کے بنائے ہوئے باطل سہارے، غیر حقیقی تعلقات، جھوٹے معبود، سیاسی غرور، مالی قوت اور ظاہری اسباب بظاہر مضبوط دکھائی دیتے ہیں، لیکن آزمائش کے وقت ان کی بے بسی آشکار ہو جاتی ہے۔ حقیقی سہارا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

قرآنی امثال کا تربیتی پیغام

ان تمام مثالوں کا مشترک پیغام یہ ہے کہ قرآن انسان کو ظاہر سے باطن، صورت سے حقیقت اور وقتی فائدے سے آخری اور دائمی انجام تک لے جانا چاہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ صدقہ محض مال نکالنے کا نام نہیں، بلکہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے حضور پیش کرنے کا نام ہے؛ نیکی محض کسی کام کا عنوان نہیں، بلکہ ایمان اور نیت سے وابستہ حقیقت ہے؛ دنیا محض آسائش نہیں، بلکہ امتحان ہے؛ توحید محض ایک عقیدہ نہیں، بلکہ شخصیت کی وحدت ہے؛ اور شرک محض مذہبی غلطی نہیں، بلکہ شعور، ارادے اور انسانیت کی تقسیم ہے۔

☆☆☆

فخرِ دو عالمؐ

...کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالمؐ بن کر

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

دنیا کی تاریخ میں بے شمار عظیم، پاکیزہ اور باکردار شخصیات آئیں، مگر حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس اپنی جامعیت، رحمت، عدل، اخلاق اور انسان دوستی کے اعتبار سے منفرد ہے، بہت سے لوگ عزت و عظمت کے ساتھ دنیا میں آئے، لیکن پوری انسانیت بلکہ تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر صرف رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ کی تعلیمات محبت، امن، انصاف اور خیر خواہی کا ایسا عالمی پیغام ہیں جو ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔

یہی وہ امتیاز ہے جس نے رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت کو زمان و مکان کی حدود سے بلند کر دیا۔ آپؐ نے مظلوم کو سہارا، یتیم کو شفقت، عورت کو عزت، غلام کو آزادی اور انسانیت کو اخوت کا درس دیا۔ اسی لیے آپؐ کی ذات صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے رحمت، امید اور ہدایت کی روشن علامت ہے۔

ماہ ربیع الاول کی آمد ہو رہی ہے جس میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہوئی، تاریکیوں سے نکل کر لوگ روشنی کی طرف سفر کرنے لگے، چور چوکیدار بن گئے، بچیوں کو زندہ در گور کرنے والے بچیوں کے محافظ ونگہبان بن گئے، یہ اس وقت ہوا جب تاریخ میں ایک انقلاب آیا، انقلاب بھی کسی کی بعثت کے ساتھ آیا، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واقعہ بلا شبہ انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلاب آفریں واقعہ ہے۔

انسانی دنیا تاریخ کے دوراہے پر کھڑی تھی، عرب میں ایک طرف جہالت، تاریکی، بدامنی اور قتل غارت گری کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف عجم کے فرماں روا اپنی بادشاہت اور تہذیب وتمدن کی آڑ میں عوام الناس کا استحصال کر کے اپنے جذبۂ جہانگیری کو تسکین دے رہے تھے۔ انسانیت کا ضمیر نفس کے پنجہ میں سسک رہا تھا، طاقتور کمزور کو اپنا غلام سمجھتا تھا اور کمزور محکومی کی حدوں سے گزر کر زورآوروں کی بندگی پہ مجبور ہو چکے تھے۔ عدل وانصاف اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا تھا، لوگوں کے پاس آسمانی ہدایت کا کوئی قابل لحاظ نسخہ اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں تھا جو اس بحرانی کیفیت کا مداوا کر پاتا۔ اہل کتاب کے احبار ورہبان کی کاروباری ذہنیت کے نتیجہ میں وحی ربانی کا وہ چشمہ صافی بھی گدلا ہو چکا تھا جو ایسی مشکل گھڑی میں ان تشنہ لبوں کی سیرابی کا سامان کر سکتا، کل ملا کر انسانی دنیا ایسے اندھیرے میں بھٹک رہی تھی جہاں روشنی کا کوئی گزر نہ تھا، تاریخ کے اس دور کو دورِ جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شب وروز کی یہ گردشیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ دنیا کے منظر نامہ پر ایک تاریخی انقلاب کا ظہور ہو۔ تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جب انسانی دنیا اس قسم کے بحرانی حالات سے دوچار ہوئی ہے تو اس کارخانۂ قدرت کے صانع حکیم نے تمدن کے گہوارہ کی حیثیت رکھنے والے مقامات پر ایسے افراد کو منصب نیابت پر مامور کیا جنھوں نے اپنی فوق العادت شخصیتوں کے ذریعہ اس ربع مسکون پر بسنے والے لوگوں کی رہبری کا فریضہ انجام دیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ حیثیت مکہ کو حاصل تھی جہاں عرب جیسی جفاکش، بلند حوصلہ اور اولوالعزم قوم آباد تھی۔ عرب قوم کی شناخت گرد ونواح میں بعض خصوصیات کی بنا پر مسلم تھی۔ اس میں قیادت کی اہلیت اور جوہر دونوں چیزیں موجود تھیں، اس میں حوصلہ وعزم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔ اس کے اندر انقلاب آفرینی کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ ایسے وقت میں عرب کے سب سے معزز اور مشہور قبیلہ قریش میں دنیا کے سب سے بڑے انسان کو اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا جو آگے چل کر جہالت وضلالت کی تاریک رات میں آفتابِ رسالت بن کر ابھرا اور بہت قلیل مدت میں اس کی جلوہ سامانی سے تمام شرق وغرب منور ہو گئے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واقعہ بلاشبہ انسانی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد نے صفحۂ ہستی پر جوانمٹ نقوش ثبت کئے ہیں، وہ آج بھی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بارہا کیا گیا اور رہتی دنیا تک کیا جاتا رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کے اعتراف کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ اس متعدد غیر مسلم انصاف پسندوں نے مقبول ومحبوب شخصیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست تسلیم کیا ہے۔ دنیا میں بڑے لوگ بہت ہوئے ہیں، مگر جو جامعیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے دنیا کی تاریخ عاجز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو بجائے خود ہمارے لیے ایک نمونۂ عمل نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کو دیکھ کر کئی لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے، ایک بکری پکانے کی تجویز ہوئی، ایک شخص نے کہا کہ اس کا ذبح کرنا

میرے ذمہ ہے۔ دوسرا بولا کہ اس کی کھال کھینچنا میرے ذمہ۔ تیسرے نے کہا اس کا پکانا میرے ذمہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لکڑیاں اکٹھا کرنا میرے ذمہ۔ آپ کے رفقا نے عرض کیا کہ حضور! یہ بھی ہم ہی آپ کی طرف سے کرلیں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! مجھے معلوم ہے کہ تم میری طرف سے کرلوگے؛ لیکن مجھے یہ بات ناگوار ہے کہ میں اپنے رفیقوں سے امتیازی شان میں رہوں اور اللہ پاک کو بھی ناپسند ہے اپنے بندے کی یہ بات کہ وہ اپنے رفیقوں سے امتیازی شان میں رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور خود لکڑیاں جمع فرمائیں۔

امتیازی شان اختیار کرنا اور کام لوگوں سے کام کروانا اور خود ہٹ کر بیٹھ جانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں تھا۔ آپ گھریلو کام میں بھی ازواجِ مطہرات کے ساتھ ہاتھ بٹایا کرتے تھے ،زندگی گزارنے کا سلیقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سکھایا۔ اس امت کی خاطر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کیں ،اب ہمیں چاہیے کہ ان دعاؤں کی لاج رکھتے ہوئے اپنے اعمال وافعال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق کرلیں کہ جنت میں جانے کا یہی طریقہ ہے۔

آج کا انسان اگر امن، محبت، عدل اور باہمی احترام پر مبنی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے تو اسے سیرتِ نبوی ﷺ سے رہنمائی لینی ہوگی۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں دلوں کو سکون، معاشروں کو استحکام اور انسانیت کو حقیقی فلاح کا راستہ ملتا ہے۔ رسولِ رحمت ﷺ کی تعلیمات ہی دنیا کو نفرت سے محبت اور ظلم سے انصاف کی طرف لے جاسکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

باہمی اُلفت ومساعدت کا رشتہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ

"یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِیْراً وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْباً" (اے افرادِ نسل انسانی! اپنے پروردگار (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو، وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا) اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کردیا، پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلادی (اور اس طرح تن تنہا ایک مورث اعلیٰ کی نسل نے خاندانوں، قبیلوں، اور بستیوں کی شکل اختیار کرلی اور رشتوں، قرابتوں کا بہت بڑا دائرہ ظہور میں آگیا) بس دیکھو! اللہ سے ڈرو جس کے نام پر باہم دگر (مہر و الفت کا) سوال کرتے ہو، نیز قرابت داری کے معاملے میں بے پروانہ ہوجاؤ، یقین رکھو کہ اللہ تم پر (تمہارے اعمال کا) کانگران حال ہے)۔

حکمت الٰہی کی یہ بڑی ہی کارفرمائی ہے کہ اس نے انسان کی پیدائش اور معیشت کا نظام کچھ اس طرح کا بنادیا کہ پہلے ایک فرد واحد سے وہ پیدا ہوتا ہے، پھر اس کی نسل سے بے شمار افراد پیدا ہوتے ہیں، پھر ہر فرد کی نسل سے الگ الگ سلسلے قائم ہوجاتے ہیں، پھر یہ سلسلے پھیلتے ہیں اور رفتہ رفتہ خاندانوں، قبیلوں، گروہوں اور بستیوں کی صورت اختیار کرلیتے ہیں، اس صورت حال نے افراد کے باہمی اجتماع واتحاد کے لیے صلہ رحمی یعنی نسلی قرابت کا رشتہ پیدا کردیا ہے، سوسائٹی کا نظام اسی پر قائم ہے، اگر اس رشتے کے مؤثرات نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت پیدا نہ ہوتی۔

یہ رشتہ باہمی الفت ومساعدت کے جذبات پیدا کرتا اور ایک فرد کو دوسرے فرد کے ساتھ ملائے رکھتا ہے، پس نظام معاشرت کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ صلہ رحمی کے حقوق کی حفاظت کی جائے ،صلہ رحمی کے حقوق خدا کے ٹھہرائے ہوئے حقوق ہیں، جو شخص ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے وہ احکام الٰہی سے سرتابی کرتا اور ظلم ومعصیت کا مرتکب ہوتا ہے۔

☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اسلامی نقوش

مفتی شکیل احمد قاسمی نمبر

ماہنامہ ’’اسلامی نقوش‘‘ تمبور ضلع سیتاپور سے نکلنے والا دینی، علمی اور ادبی مجلہ ہے، جس کو ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں صاحب (ناظم شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ) کی سرپرستی حاصل ہے، اور اس کی مجلسِ ادارت میں علی گڑھ سے ڈاکٹر عبید اقبال عاصم صاحب، جامعہ ملیہ دہلی سے ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی صاحب، دیوبند سے اشرف عثمانی صاحب، ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے ڈاکٹر محمد فرمان ندوی صاحب اور پھلت مظفر نگر سے مولانا وصی سلیمان ندوی صاحب جیسے اہلِ قلم شامل ہیں، جب کہ اس کے مدیر اور روحِ رواں مولانا مفتی خبیر احمد ندوی صاحب ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے ۴۸۰ ؍صفحات پر مشتمل اس مجلہ کا ایک ضخیم اور دیدہ زیب شمارہ ہے، جو ضلع سیتاپور کی ایک معروف ومقبول دینی و علمی شخصیت مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی صاحب رحمہ اللہ کی یاد میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ اپریل تا جون ۲۵ء کا شمارہ ہے، اور جلد نمبر ۲۵ ہے۔

مفتی شکیل احمد قاسمی صاحبؒ کی شخصیت اہلِ ہند کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہے؛ وہ مختلف صلاحیتوں کے مالک تھے، اور ان کی شخصیت مختلف پہلوؤں کی حامل تھی؛ مسندِ تدریس ہو، یا پند و وعظ کا منبر، تصنیف و تالیف کی میز ہو یا جلسوں اور پروگراموں کا اسٹیج، ہر جگہ انھوں نے اپنے آثار ونقوش چھوڑے ہیں، اور ہمیں ان کے شعری ذوق کا تو علم تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں کثرت سے برموقع و برمحل اشعار پڑھتے تھے، اس شمارہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بذاتِ خود شاعر بھی تھے۔

مفتی صاحبؒ نے دار العلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں اور مقبول استاد کی حیثیت سے رہے۔ دارالعلوم کے علاوہ انھوں نے ملک کے اطراف واکناف میں دیگر مدارس میں بھی اپنی تدریسی صلاحیت کے جلوے بکھیرے۔ تقریر وخطابت کے میدان میں انھوں نے اپنا خاص رنگ وآہنگ اپنایا، اور مشہور ہوئے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں ’’تقریرِ حاوی‘‘ اور ’’شرح سلم میزان العلوم‘‘ ان کی علمی و تحقیقی یادگاریں ہیں، جب کہ ’’دیکھنا تقریر کی لذت‘‘ کو طلبۂ مدارس میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، اور انھوں نے اس سے خوب استفادہ کیا۔

مفتی صاحبؒ سیتاپور کے تھے، اور ’نقوشِ اسلام‘ بھی سیتاپور کا مجلہ ہے۔ حق بنتا تھا کہ وہ مفتی صاحب کی شخصیت، احوال و کوائف، محاسن و کمالات کا ذکر کرے، اور ان کو محفوظ کرنے کی سعی کرے۔ اسی احساس کے تحت مدیرِ مجلہ نے یہ شمارہ ان کی یاد کے ساتھ خاص کیا ہے، جو پورے خطہ کی طرف سے اک فرضِ کفایہ کی ادائیگی ہے۔

اس شمارہ کی مضامین کی بات کریں تو ملک کی اعلی سطح کی دینی وعلمی شخصیات کی تحریریں اس شمارہ کی زینت ہیں، اور استناد بھی۔ مختلف مکاتبِ فکر، مختلف تعلیمی اداروں سے منسلک اشخاص، اور عصری و دینی دونوں طرح کی شخصیات نے مفتی صاحبؒ کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے، اور اس کے حوالہ سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

ترتیب و پیش کی بات کریں تو یہ شمارہ مدیر صاحب کی تحریر ’’خراجِ عقیدت‘‘ کے علاوہ جو بیک وقت اداریہ بھی ہے اور مقدمہ بھی‘ سات ابواب پر مشتمل ہے؛

بابِ اول: ’’تعزیتی پیغامات‘‘ میں ملک کے معروف ترین دینی تعلیمی اداروں کے اعلی عہدیداران ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی، مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا مفتی ابو القاسم نعمانی، سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور مولانا محمد عاقل صاحبؒ، مہتمم دار العلوم وقف دیوبند مولانا محمد سفیان صاحب، ناظم مدرسہ مظاہر علوم وقف سہارنپور مولانا محمد سعیدی صاحبؒ، ناظم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ مولانا حبیب احمد باندوی صاحب کی تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔

باب دوم: ’’مقالات و مضامین‘‘ پر مشتمل ہے، جس کے قلم کاروں میں علماء ودانشورانِ ملت شامل ہیں، چند اہم ناموں میں یہ پیش کیے جاسکتے ہیں: مولانا عبد الخالق مدراسی صاحب، مولانا غلام کبریا آرزوؒ، مولانا عبد العلی فاروقی، حیدر علی جعفری ایڈوکیٹ، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، محمد عارف نگرامی۔

بابِ سوم: ’’منظوم خراجِ عقیدت‘‘ سے عبارت ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے، مراثی اور

قطعات تاریخ وفات۔

بابِ چہارم: تین حصوں پر مشتمل ہے؛ مکتوبات، تخلیقات (نعتیں، غزلیں، متفرق اشعار)، اور تصنیفات۔

بابِ پنجم: مفتی صاحبؒ کے معاصرین کی وفیات سے تعلق رکھتا ہے۔

بابِ ششم: ''تعارف وتبصرہ'' کے نام سے معنون ہے، جس میں مدیر مجلہ کے قلم سے نکلے ہوئے مختلف کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔

بابِ ہفتم: مفتی صاحبؒ کے انتقال اور تعزیتی نشستوں کی خبروں پر مشتمل ''اخباری تراشے'' پیش کرتا ہے۔

راقمِ سطور کے خیال میں اگر بابِ پنجم کو مرتب مجلہ کی جدت تسلیم کرلیا جائے تو بابِ ششم کو مجلہ کے آخر میں ترتیب دیا جانا بہتر ہوتا؛ تاکہ مفتی صاحبؒ کے حوالہ سے جتنا کچھ مواد ہے' اس کی ترتیب میں خلل نہ پڑتا، مزید یہ کہ اس کو 'باب' کا عنوان نہ دیا جاتا۔ دوسری بات یہ کہ 'نقوشِ اسلام' میں اخباری تراشے بھی دیے جاتے ہیں، جن سے مدیر مجلہ کی ملی وعلمی سرگرمیوں کی خبر ملتی ہے۔ اس مجلہ میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ بھی مجلات اور بالخصوص ان کی خاص اشاعتوں کی ترتیب و پیش کش کے فن میں ایک نئی سوچ اور نیا زاویۂ فکر معلوم ہوتا ہے۔

الغرض اپنی نادر ترتیب وپیش کش کے ساتھ 'نقوشِ اسلام' کا یہ شمارہ مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی رحمہ اللہ کی حیاتِ مستعار کا ایک بھرپور خاکہ پیش کرتا ہے۔

حصول کے لیے رابطہ کریں:

۹۹۳۶۹۹۳۱۹۶

کلیاتِ بلالی

مولانا شیر علی بلالیؒ

مولانا شیر علی بلالی (۱۹۱۸ء-۱۹۸۷ء)، ضلع بہرائچ کے رہنے والے تھے۔ 'بلالی' ان کے استاذ کی طرف سے دیا گیا لقب تھا، کہ وہ قدرے سیہ فام تھے۔ انھوں نے 'دار المبلغین، لکھنؤ' میں تعلیم حاصل کی، جس کی وجہ سے آپ کو لکھنؤ میں قیام میسر آیا اور یہاں سراج لکھنوی اور حضرت شمس لکھنوی جیسے باکمال شعراء سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، اور آپ نے لکھنؤ کی ادبی وشعری فضا سے خوب فائدہ اٹھایا، اور اپنی لسانی وشعری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

'کلیاتِ بلالی' ان کے منظوم کلام کا مجموعہ ہے، جس کو ان کے صاحبزادے اور راقمِ سطور کے رفیقِ درس جناب ڈاکٹر ادیب الرحمن غزالی ندوی نے ترتیب دیا ہے، جو خود بھی عمدہ شاعری کرلیتے ہیں۔

مولانا شیر علی بلالی' ایک دینی مزاج شخصیت کے حامل شاعر ہیں؛ انھوں نے اپنی شعری صلاحیت کو گویا خدمتِ دین کے لئے وقف کیا۔ آپ نے حمد ونعت کے ساتھ تاریخِ اسلام اور سیرت کے بہت سے واقعات کو خوبصورت شعری قالب میں ڈھالا۔ آپ کی شاعری میں استاد شعراء کے کلام کی جھلک ملتی ہے، خاص طور پر واقعہ نگاری میں آپ حفیظ جالندھری جیسے شعراء کے ہم پلہ معلوم ہوتے ہیں۔

کلیاتِ بلالی کا ایک بڑا حصہ 'آفتابِ کربلا' کے عنوان کے ساتھ سیدنا حسین کی شہادت کے سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے، اور بڑا مؤثر ہے، جس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ دار المبلغین کی فضانے آپ کو اس موضوع کی شعور آگہی کے ساتھ لکھنوی زبان میں اس کا اظہار بھی سکھایا۔ اس کے علاوہ واقعۂ معراج، واقعۂ ہجرت کو بھی آپ نے خوب نظم کیا ہے۔

ہماری رائے میں جن کتابوں کا بچوں کی دینی و ادبی تربیت کے لئے والدین انتخاب کرتے ہیں' ان میں کلیاتِ بلالی کو بھی شامل کرلینا چاہیے۔

مذکورہ بالا موضوعات سے ہٹ کر کہ وہ طویل سلسلہ رکھتے ہیں، مولانا موصوف کے چند قطعات بھی ہیں۔ انھی میں سے چند بہ طورِ نمونہ ملاحظہ کریں:

نادار کوئی آیا تو رنجور ہوگئے
زردار کوئی آیا تو مسرور ہوگئے
جتنے ہی حق پرست بنے شیخِ نامدار
اتنے ہی حق کی راہ سے وہ دور ہوگئے

علماءِ سوء پر تنقید بھی دیکھیں:

دوسروں سے کہہ رہے ہیں فکرِ عقبیٰ چاہیے
خود جنابِ شیخ کو دنیا ہی دنیا چاہیے
میں دلِ بیباک رکھتا ہوں مری جرات معاف
دامنِ یوسف نہیں، دستِ زلیخا چاہیے

خودشناسی کی ایک مثال دیکھئے:

اک تبصرہ کتاب پہ لکھنا ضرور ہے
دنیا میں نام آپکا نزدیک و دور ہے
گم نام ہوں تو کیا مرے اشعار ہیں بلند
شہرت مری نہیں تو یہ کس کا قصور ہے

اپنے لقب کی کیا خوب پذیرائی کی ہے:

بلالی رنگ می دارم کہ رنگ مصطفیٰ دارم
بہ دل حب محمد چوں بلال پارسا دارم

حصول کے لئے رابطہ کریں:

۹۸۰۷۵۶۳۴۷۱

☆☆☆

منزل به منزل

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عربی ترجمہ

ایک مثالی وتقلیدی کارنامہ

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ علم وتحقیق کے میدان میں مؤثر خدمات انجام دینے کے لیے کسی دینی ادارے سے وابستگی ناگزیر ہے، اور اگر کوئی عالم دین عصری مضامین کی تدریس، کسی کمپنی کی ملازمت یا دیگر دنیوی مصروفیات میں مشغول ہو تو وہ کوئی نمایاں علمی یا دینی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور محض ایک مغالطہ نہیں بلکہ ہمت شکنی کا باعث اور دینی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کے لیے ایک جواز بھی بن چکا ہے۔

تاریخ اور عصرِ حاضر، دونوں اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ علمی وتحقیقی خدمات صرف دینی مراکز یا مدارس کی چار دیواری تک محدود نہیں ہیں۔ ایسے اہل علم کی کمی نہیں جنہوں نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات اور رسمی ملازمتوں کے باوجود گراں قدر علمی وتحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اہم اور تازہ مثال حال ہی میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عربی ترجمہ ہے، جس کی سعادت مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا آفتاب عالم اعظمی ندوی، ڈاکٹر حسیب الرحمن ندوی اور ڈاکٹر صاحب عالم اعظمی ندوی کو حاصل ہوئی ہے۔

یہ علمی وتحقیقی خدمت اس حقیقت کا روشن ثبوت ہے کہ اخلاص، عزم اور حسنِ تنظیم کے ساتھ دینی و علمی کام کسی بھی شعبۂ زندگی سے وابستہ رہتے ہوئے انجام دیے جاسکتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''سیرت النبی'' بجا طور پر سیرتِ نبویؐ پر لکھی جانے والی عظیم ترین اور جامع ترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔ اپنی جامعیت، علمیت، تحقیقی استحکام، فنی شان اور ہمہ گیر افادیت کے باوجود یہ شاہکار طویل عرصے تک عربی زبان کے قالب میں نہیں ڈھل سکا تھا۔

اگرچہ اس جانب متعدد اہل علم اور اصحاب زبان نے توجہ دی، لیکن اس عظیم خدمت کی سعادت بالآخر مولانا رحمت اللہ ندوی اور ان کے رفقائے کار کے حصے میں آئی۔ چنانچہ ان کی شب و روز کی انتھک محنت، علمی کاوش اور مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں یہ بے مثال تصنیف عربی زبان میں منتقل ہوکر زیور طباعت سے آراستہ ہوگئی۔

مولانا رحمت اللہ ندوی اسی عربی ترجمے کا تازہ شائع شدہ نسخہ لے کر ندوۃ العلماء تشریف لائے، جہاں انہوں نے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم سے ملاقات کی اور عربی ترجمے کا نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔

حضرت ناظم صاحب نے اس موقع پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''سیرت النبی'' اپنے موضوع پر ایسی منفرد کتاب ہے جس کا ہم پلہ مواد نہ عربی میں موجود ہے اور نہ اردو میں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب میں شریعت اسلامیہ کا مغز اور نچوڑ نہایت متوازن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بقول اس عظیم تصنیف کو عربی قالب میں منتقل کرنا ندوۃ العلماء پر ایک قرض تھا، جسے مولانا رحمت اللہ ندوی اور ان کے رفقائے کار (مولانا آفتاب عالم اعظمی ندوی، ڈاکٹر حسیب الرحمن ندوی اور ڈاکٹر صاحب عالم اعظمی ندوی) نے ادا کیا ہے۔ انہوں نے پوری ٹیم کے لیے دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عظیم علمی خدمت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

حضرت ناظم نے مزید فرمایا کہ وہ ندوہ کے فضلاء سے ہمیشہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی ''سیرت النبی'' کا مطالعہ نہیں کرتا تو اس کے لیے ندوی کہلانا مناسب نہیں، کیونکہ یہ کتاب ندوہ کی علمی روایت اور فکری سرمایہ کی نمائندہ تصنیف ہے۔

اس موقع پر قائم مقام مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی بھی موجود تھے۔ انہوں نے بھی اس عظیم علمی خدمت پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور مترجمین کو دعاؤں سے نوازا۔

بعد ازاں مولانا رحمت اللہ ندوی نے مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور عربی ترجمے کی یہ علمی کاوش ان کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت مہتمم صاحب نے مترجمین کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے انہیں اپنی دعاؤں اور حوصلہ افزائی سے نوازا۔

اسی مناسبت سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں اختصاص کے طلبہ کے لیے ایک علمی نشست بھی منعقد ہوئی، جس میں مولانا رحمت اللہ ندوی نے ''سیرت النبی'' کی خصوصیات و امتیازات، فن ترجمہ کی باریکیوں، تحقیق کے اصولوں اور اس عظیم

منصوبے پر کام کرنے کے دوران پیش آنے والے اپنے علمی تجربات کا نچوڑ پیش کیا۔

مولانا رحمت اللہ ندوی نے اپنے خطاب کا آغاز اس اعتراف سے کیا کہ وہ بھی ندوۃ العلماء کے ایک طالب علم رہے ہیں اور انہیں اپنے اساتذۂ کرام کی تربیت، رہنمائی اور اشراف میں علمی ذوق حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے اساتذہ کے ساتھ گزارے ہوئے علمی لمحات اور تربیتی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہی عملی تربیت ان کی علمی زندگی کا اصل سرمایہ ہے۔

انہوں نے اس کتاب کو اپنے اساتذہ کی علمی امانت قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ دراصل "بِضَاعَتُكُمْ رُدَّتْ إِلَيْكُمْ" کا مصداق ہے۔

"سیرت النبی" ہی کا انتخاب کیوں؟

مولانا رحمت اللہ ندوی نے کہا کہ اگرچہ سیرتِ نبوی پر قدیم و جدید زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن انھوں نے سیرت النبی کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ محض واقعات کی ترتیب پر مشتمل کتاب نہیں، بلکہ ایک منفرد علمی، تحقیقی اور تجزیاتی شاہکار ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اس کی خصوصیات و امتیازات کو تفصیل سے پیش کیا جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

منفرد علمی و تحقیقی منہج

انہوں نے کہا کہ قدیم مصادر، مثلاً طبقات ابن سعد، سیرت ابن کثیر، تاریخ طبری اور مغازی کی کتابیں اپنی اپنی جگہ بنیادی مراجع ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا دائرۂ کار محدود ہے۔ کوئی روایت پر زیادہ اعتماد کرتی ہے، کوئی واقعات کے بیان پر، اور کوئی تاریخی ترتیب پر۔ اس کے برخلاف سیرت النبیؐ کو یہ امتیازات حاصل ہیں:

- تاریخی، تحلیلی اور تنقیدی اسلوب کو یکجا کیا گیا ہے۔
- روایات کو محض نقل نہیں کیا گیا بلکہ محدثین کے اصولِ نقد کے مطابق ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔
- روایت اور درایت، دونوں معیاروں پر واقعات کی جانچ کی گئی ہے۔
- جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں سابقہ مؤرخین کی آراء پر احترام کے ساتھ علمی نقد بھی کیا گیا ہے۔

انہوں نے واضح کیا کہ اس تنقید کا مقصد اکابر کی عظمت میں کمی نہیں بلکہ علمی تحقیق کو مضبوط بنانا ہے، کیونکہ یہی قدیم کتابیں بعد کی تمام تصنیفات کی بنیاد ہیں۔

مستشرقین اور جدید اعتراضات کا جواب

علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے یہ کتاب ایسے دور میں لکھی جب مستشرقین، ملحدین اور روشن خیال حلقوں کی جانب سے سیرتِ نبویؐ پر مسلسل اعتراضات کیے جا رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے محض تاریخی واقعات بیان کرنے کے بجائے ان اعتراضات کا علمی، تحقیقی اور عقلی جواب دیا اور جدید ذہن کو مخاطب بنایا۔

شریعت کے فلسفے اور عقلی استدلال کی وضاحت

اس کتاب میں معراج، معجزات اور دیگر اہم واقعات کو صرف نقل نہیں کیا گیا بلکہ ان کے پس منظر، حکمت اور عقلی پہلوؤں کو بھی واضح کیا گیا ہے، تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکے اور اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے اشکالات دور ہوں۔

اخلاقیاتِ نبویؐ کی جامع پیش کش

عام طور پر سیرت کی کتابوں میں رسول اکرم ﷺ کے حلیۂ مبارک اور ظاہری اوصاف پر تو مفصل گفتگو ملتی ہے، لیکن اخلاقیات، دعوتی اسلوب، جنگ و امن کے اخلاقی اصول اور عملی زندگی کے مختلف پہلو اس جامع انداز میں کم ملتے ہیں۔ ''سیرت النبی'' کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں اخلاقیاتِ نبویؐ کو نہایت مدلل اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ادبی شاہکار

انہوں نے کہا کہ ''سیرت النبی'' کی زبان نہایت بلند پایہ ادبی زبان ہے، اس لیے ترجمے کے دوران اصل اسلوب، روانی اور ادبی حسن کو برقرار رکھنا مترجم کے لیے سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''ظہور قدسی'' والی عبارت اتنی ادیبانہ ہے کہ عربی میں اس کی ترجمانی کے لیے ہمیں خاصی محنت کرنی پڑی۔

شبلی علیہ الرحمہ کے منصوبے کی تکمیل

مولانا نے بتایا کہ اگرچہ علامہ شبلی نعمانیؒ پوری کتاب مکمل نہ کر سکے، تاہم وہ اس کا تفصیلی خاکہ اور متعدد مسودات تیار کر گئے تھے، جن کی بنیاد پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس عظیم منصوبے کو نہایت کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ترجمہ اور تحقیق کے حوالے سے گفتگو

مولانا رحمت اللہ ندوی نے سیرت النبی کی خصوصیات کے ساتھ ترجمہ و تحقیق کے سلسلہ میں اپنے تجربات بھی بیان کیے۔

انھوں نے کہا کہ اس کتاب کا ترجمہ ان کے

لیے صرف ایک علمی خدمت نہیں بلکہ ایک تعلیمی سفر بھی ثابت ہوا۔ ان کے بقول: ''جتنی محنت میں نے اس کتاب پر کی، اس سے کہیں زیادہ میں نے اس کتاب سے سیکھا ہے۔''

انہوں نے واضح کیا کہ ترجمہ صرف ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام نہیں بلکہ ترجمانی ایک مستقل فن ہے، جس میں مصنف کے اسلوب، فکر، علمی پس منظر اور مقصود کو مکمل دیانت کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے خاص طور پر اس امر کی نشاندہی کی کہ سیرت النبیؐ کی زبان نہایت ادبی ہے، اور اس ادبی اسلوب کو عربی زبان میں برقرار رکھنا مترجم کے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا۔

تحقیق کی عملی دشواریاں

انہوں نے بتایا کہ دورانِ ترجمہ متعدد ایسے مقامات آئے جہاں عبارت، مفہوم یا تاریخی روایت کے بارے میں اشکالات پیدا ہوئے۔ ان کے حل کے لیے انہوں نے اپنے اساتذہ اور اکابر علماء سے مسلسل رجوع کیا۔ بعض مسائل میں مختلف آراء سامنے آئیں، لیکن تحقیق کے بعد وہ ایک اطمینان بخش نتیجے تک پہنچ سکے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی بعض ایسی منفرد آراء اور تفردات موجود ہیں جن سے عام قارئین بلکہ بہت سے محققین بھی واقف نہیں ہوتے، اس لیے مترجم کو ہر مقام پر نہایت احتیاط سے کام لینا پڑا۔

محقق کی ذمہ داریاں

اس موقع پر مولانا نے تخصص کے طلباء کو خاص طور پر کو مخاطب کرتے ہوئے تحقیق کے بنیادی اصولوں کی طرف توجہ دلائی۔

انہوں نے **الأبواب و التراجم لصحيح البخاري**" پر کام کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ جب وہ مولانا علی میاںؒ کے مقدمے کا مطالعہ کر رہے تھے تو انہیں محسوس ہوا کہ عبارت کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ کتاب کے دو صفحات کئی برسوں سے مفقود تھے، لیکن مسلسل اشاعت کے باوجود کسی نے اس خامی کی نشاندہی نہیں کی۔

اس واقعہ سے انہوں نے یہ نتیجہ پیش کیا:

- محقق کو ہر عبارت تنقیدی نظر سے پڑھنی چاہیے۔ کسی شخصیت کی عظمت تحقیق میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔
- علمی دنیا میں شخصیت پرستی کے بجائے کام اور متن کو معیار بنانا چاہیے۔
- بغیر تحقیق کے کسی عبارت کو قبول کرنا محقق کے شایانِ شان نہیں۔

انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ ہمارے ہاں شخصیات کا احترام تو بہت ہے، لیکن ان کی تصانیف کا گہرا مطالعہ نسبتاً کم کیا جاتا ہے۔

اساتذۂ کرام کی تربیت ہی اصل سرمایہ

اپنے اساتذۂ کرام کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ندوۃ العلماء میں حاصل ہونے والی عملی تربیت، املا نویسی، علمی مذاکرے اور اساتذہ کی اصلاح و رہنمائی نے ان کی علمی زندگی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔

اس علمی و فنی گفتگو سے قبل استاذ حدیث مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی نے مولانا رحمت اللہ ندوی کا تفصیلی تعارف کرایا، تحقیق و ترجمہ کے میدان میں ان کی متنوع خدمات پر روشنی ڈالی اور موضوعِ مجلس کی فنی مباحث پر گفتگو کی۔

اس نشست میں استاذ فقہ و حدیث مفتی عتیق احمد بستوی بھی موجود تھے، انھوں نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

اس موقع پر مولانا محمد فیضان نگرامی ندوی، مولانا محمد وثیق ندوی، مولانا اصطفاء الحسن ندوی، مولانا سلمان نسیم ندوی، مولانا عبداللہ مخدومی ندوی وغیرہ موجود تھے۔

☆☆☆

زندہ قوم کے لئے اہم ترین مسئلہ

حضرت مولانا سید محمد الحسنیؒ

اس وقت جو نصاب تعلیم سرکاری مدارس میں پڑھایا جارہا ہے، وہ ایسا ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد کوئی مسلمان بچہ (اگر وہ صرف اسی نصاب پر انحصار کرے) مسلمان باقی نہیں رہ سکتا، اس لیے اس نصاب تعلیم پر تکیہ کر کے بیٹھ جانا خودکشی کے مرادف ہے۔

دینی تعلیم کا مسئلہ مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے لوگوں کو آواز دے رہا ہے کہ وہ اپنے سارے اختلافات بالائے طاق رکھ کر اس اہم مسئلہ میں یکسو ہوجائیں اور ایک متوازی نظام تعلیم کا جال بچھا دیں جو ان کو غلامی سے بے نیاز کردے، ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں یہ کام اس سے قبل کر لینا ہوگا کہ لگام ہمارے ہاتھوں سے جاتی رہے اور کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔

☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالےٰ

Date 10th August 2026

تاریخ ۱۰ر اگست ۲۰۲۶ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں:
Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا